بسم اللہ الرحمن الرحیم

وعد الله الذين آمنوا منكم وعملوا الصالحات ليستخلفنهم في الأرض كما استخلف الذين من قبلهم وليمكنن لهم دينهم الذي ارتضى لهم وليبدلنهم من بعد خوفهم أمنا يعبدونني لا يشركون بي شيئا ومن كفر بعد ذلك فأولئك هم الفاسقون (سورۃ نور)

حق الیقین

ردّ

ہفوات المنافقین

تصنیف لطیف

سیدنا و امامنا حضرت میرزا بشیر الدین محمود احمد خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز

جسمیں

حضور انور نے ایک غالی شیعہ کی کتاب ہفوات المسلمین کے ان بے بنیاد اعتراضات کا نہائت لطیف اور مدلل پیرایہ میں جواب رقم فرمایا ہے جو اسنے اپنی کم فہمی سے حضرات ائمہ اسلام پر کئے ہیں جنکی زد حضرت نبی کریم صلعم امہات المومنین رض اور صحابہ کرام رض پر بھی پڑتی ہے

جسے مینیجر بکڈپو تالیف و اشاعت قادیان نے شائع کیا

بار اول

تعداد ۱۰۰۰

دسمبر ۱۹۲۶

مینیجر بکڈپو قادیان پبلشر نے وزیر ہند پریس امرت سر میں باہتمام بھائی بہادر سنگھ مینیجر و پرنٹر چھپوایا

مختصر فہرست کتب حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام

نام کتاب مع مضمون	زبان	قیمت
پرانی تحریریں۔ تین قابل قدر مضامین یعنی وید و فرقان کا مقابلہ۔ الہام کی حقیقت اور آریوں کے قدامت روح کی اصلیت۔	اردو	۳/
براہین احمدیہ چہار جلد حقیت اسلام دلائل توڑنے والے کو انعام اور بعض آیات کی تفسیر	"	عہ/۸
سرمہ چشم آریہ۔ ردّ آریہ میں ایک مکمل کتاب۔	"	عہ/۴
شحنہ حق۔ آریوں کی تردید میں۔	"	۸/
فتح اسلام۔ بیان دعویٰ خود و ذکر پنج شاخ	"	۳/
نور الحق۔ ہر دو حصہ۔ ردّ عیسائیت و پیشگوئی کسوف خسوف	عربی مترجم اردو	۱۴/
آسمانی فیصلہ دعا کے ذریعہ مخالفین سے فیصلہ کرنیکی تجویز اور استخارہ کا طرز۔	اردو	۳/
انوار الاسلام۔ ردّ عیسائیت۔ عبداللہ آتھم والی پیشگوئی کی تفصیل۔	"	۴/
نور القرآن مکمل۔ خصوصیت سے ردّ عیسائیت میں اور دیگر مذاہب باطلہ میں۔ مکمل	"	۹/
ضیاء الحق۔ ردّ عیسائیت و جواب بعض اعتراضات متعلق پیشگوئی عبداللہ آتھم۔	"	۳/
استفتاء لیکھرام کا قتل پیشگوئی سے ہوا	"	۱/
تحفہ قیصرہ۔ شکریہ سلطنت ملکہ معظمہ قیصرہ ہند اور انکو دعوت اسلام	"	۴/

نام کتاب مع مضمون	زبان	قیمت
سراج منیر۔ چند پیشگوئیوں کا پورا ہونا	اردو	۶/
سراج الدین عیسائی کے چار سوالوں کا جواب۔ ردّ عیسائیت	"	۳/
ایام الصلح۔ دعویٰ مع دلائل و پیشگوئی طاعون۔ اردو۔	"	عہ/
حقیقت المہدی۔ آنیوالا مہدی صلح کار ہے یا خونی۔	اردو و عربی	۱/
اربعین ہر چہار نمبر نشان صداقت مرسلین اور ایک نعمت کی طرف دعوت	اردو	۱۲/
خطبہ الہامیہ۔ قربانی کی اصل حقیقت و ثبوت دعویٰ خود و تفسیر چند آیات	عربی مترجم اردو فارسی	عہ/۴
تریاق القلوب۔ چند پیشگوئیوں کے گواہوں کے نام اور پورا ہونے کی تفصیل	اردو	۴/
حقیقۃ الوحی۔	"	ص/
کشتی نوح۔ طاعون سے بچنے کا طریق اور احمدی تعلیم کی تفصیل	"	۶/
لیکچر لاہور۔ اسلام اور دیگر مذاہب	"	۴/
لیکچر سیالکوٹ کرشن ہونیکا ثبوت	"	۴/
چشمہ معرفت ردّ آریہ	"	عہ/۸
نزول المسیح نشانات صداقت	"	۱۲/
آئینہ کمالات اسلام	"	۸/

نعوذ باللہ من الشیطان الرجیم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

خدا کے فضل اور رحم کے ساتھ

ھو الناصر

ایک کتاب مسمیٰ بہ ہفوات المؤمنین فی تفضیح سید المرسلین وتقبیح امہات المؤمنین من کتب المؤرخین والمفسرین والمحدثین۔ حال ہی میں ایک صاحب کی طرف سے جن کا نام مرزا احمد سلطان ہے لکھنؤ کے مطبع نور المطابع سے شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب کے مصنف کا منشا اس دل آزار اور سب وشتم سے پُر کتاب کے شائع کرنے سے ان کے اپنے الفاظ میں یہ ہے کہ "مذہب اہل سنت کی کوئی کتاب ایسی نہیں کہ جس میں خدا وانبیاء ورسل کی تفضیح نہ ہو اور سب سے زیادہ تفضیح حضور سید المرسلین وامہات المؤمنین کی کتب اسلامی میں ہے لیکن ان جملہ تفضیحات میں حضور سید المرسلین وامہات المؤمنین کی تفضیحات وتقبیحات نہایت روح فرسا اور بیخ کن اسلام ہیں اسلئے ان دو قسموں کی احادیث کے تھوڑے تھوڑے نمونے اس غرض سے پیش کئے جاتے ہیں کہ ہمارے غیور مسلمان اون احادیث واہیہ وروایات کاذبہ کو کتب اسلامی سے خارج فرما کر خدا اور رسول کی خوشنودی کا پروانہ حاصل کریں اور چونکہ وہ موضوعہ عبارات بزرگان دین ومعتبران اسلام کے نام نامی سے احادیث مشہور کردیگئی ہیں اسلئے ہفوات امام بخاری اور بالخصوص خاتمہ کتاب ہذا سے ثابت کردیا گیا ہے کہ ایسی جملہ احادیث دشمنان رسول ومعاندان امہات المؤمنین کے تحائف ہیں جنکو نامحقق محدثین نے منقولات اسلاف کے نام نامی سے دہوکھا کھا کر اپنی اپنی جوامع ومسانید وصحاح وسنن ومعاجم میں درج کرلیا ہے پس ان کے اخراج واحکاک واحراق کرنے میں اجر عظیم اور ثواب فخیم ہے" ہفوات صفحہ ۲۔ اس تحریر اور خصوصًا طرز بیان سے معلوم

ہو سکتا ہے کہ مصنف ہفوات کا منشا اس کتاب کی تصنیف سے حق جوئی اور صداقت طلبی نہیں ہے بلکہ پردہ پردہ میں ائمۂ اسلام اور بزرگان دین کو گالیاں دینا ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس تصنیف کی اصل مخاطب اہلحدیث صاحبان ہیں اور اگر وہی مسلک ہم اختیار کرتے جو وہ لوگ ہمارے متعلق اختیار کیا کرتے ہیں تو شائد ہمارا طریق بھی یہ ہوتا کہ ہم اس جنگ کا لطف دیکھتے اور ایکدوسرے کی فضیحت اور تحقیر کو خاموشی سے ملاحظہ کرتے لیکن چونکہ ہمارا رویہ تقوی پر مبنی ہے اور اسلام کی محافظت اور اس کے خزائن کی نگرانی کا کام ہمارے سپرد کیا گیا ہے اسلئے میری غیرت نے برداشت نہ کیا کہ یہ کتاب بلا جواب کے رہے اور اسلام کے چھپے دشمن اسلام کے ظاہری دشمنوں کے ساتھ ملکر اس کے اندر رخنہ اندازی کرنیکا کام بلا روک ٹوک کرتے چلے جائیں!

کسی مذہب کی خوبی اسکے ثمرات سے پہچانی جاتی ہے حضرت مسیح علیہ السلام فرماتے ہیں "ہر ایک اچھا درخت اچھا پھل لاتا ہے اور برا درخت برا پھل لاتا ہے۔ اچھا درخت برا پھل نہیں لا سکتا نہ برا درخت اچھا پھل لا سکتا ہے۔ جو درخت اچھا پھل نہیں لاتا وہ کاٹا اور آگ میں ڈالا جاتا ہے پس ان کے پھلوں سے تم انہیں پہچان لوگے" متی باب ۷ آیت ۱۷ تا ۱۹۔ اگر ایک شخص دنیا کی اصلاح اور اسکے درست کرنیکے لئے مامور ہونیکا دعوی کرتا ہے لیکن اسکی سب کوششیں اکارت جاتی ہیں اور وہ ایک ایسی جماعت چھوڑ جاتا ہے جو بے دین اور منافق اور خدا سے دور ہوتی ہے تو یقیناً اس کا دعوی باطل ہے کیونکہ یہ ممکن نہیں کہ ایک شخص کو اللہ تعالی ایک کام کیلئے بھیجے اور وہ اس کام میں ناکام رہے اسکی تربیت یافتہ اور صحبت سے مستفیض ہونیوالی جماعت کا بیشتر حصہ اسکے اثر سے متاثر ہونا چاہیئے اور اسکی تعلیم کا حامل اور عامل ہونا چاہیئے ورنہ اسکی آمد فضول اور اسکی بعثت عبث ہو جاتی ہے۔ اسی طرح یہ ممکن ہی نہیں ہو کہ ایک نیک اور پاک جماعت کی تربیت کے ماتحت ایک ایسی جماعت پیدا ہو جائے جو بلا تدریج شرارت اور فتنہ کا مجسم نمونہ بنجائے۔ ہمیشہ خرابی آہستگی سے پیدا ہوتی ہے جس قدر جماعتیں دنیا میں خراب ہوئی ہیں تدریجاً ہی خراب ہوئی ہیں اور ایک نسل کے بعد دوسری نسل کمزور ہوتے ہوتے آخر اسلاف کے اثر مٹ گئے ہیں۔

پس جو شخص یہ بتانا چاہتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ اور ان کی بعد خدمت اسلام

کرنیوالے لوگ درحقیقت منافقوں کی ایک جماعت تھی اور اسلام صرف رسول کریم صلی اللہ علیہ
وسلم کے دم تک تھا یا آپکے بعد آپکے چند رشتہ داروں کے دلوں میں اسکا اثر محدود ہو گیا وہ یا تو
قانون قدرت اور انبیاء کی شان سے بالکل ناواقف ہے، یا پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا پوشیدہ
دشمن ہے کہ آپکو ناکام اور نامراد ثابت کرنا چاہتا ہے اور اسلام کو ایک بے ثمر درخت اور بے اثر تعلیم
بتا کر دشمنوں کو خوش کرنا اور اسلام کی وقعت کو گرانا چاہتا ہے۔

دنیائے اسلام کا بیشتر حصہ ان احادیث پر اپنی بہت سی فقہ اور تفصیلات تعلیم کا انحصار
رکھتا ہے اور گو اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر احادیث کی کتب نہ ہوتیں تو اسلام کا کوئی حصہ تو
مخفی نہ رہتا لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اگر یہ کتب نہ ہوتیں تو اب جس طرح ایک تدبر کرنیوالے
انسان کیلئے اپنے آقا کے کلام میں اپنے تدبر کی تائید دیکھکر ایک خوشی کا سامان پیدا ہوتا ہے
اور وہ اپنے آپکو عالم خیال میں اپنے محبوب کی مجلس ارشاد میں ہدایت کے موتی چنتے ہوئے پاتا ہے
وہ بات نہ رہتی۔ اسی طرح تاریخ اسلام کا ایک بیشتر حصہ بھی جو مردہ روحوں کو تازہ کرنیوالا اور
صدیوں کے گذرنے پر بھی استاد اور شاگرد اور آقا اور غلام اور عکس اور ظل میں شدید اتصال
پیدا کرنیکا موجب ہے معدوم ہو جاتا۔ غرض تکمیل دین کیلئے گو احادیث کی ضرورت نہیں لیکن
فقہ اور قیاس کی رہنمائی کرنے اور اطمینان قلب اور زیادہ تعلق کیلئے وہ ایک بیش بہا ذریعہ
ہیں اور سنت کیلئے بھی بطور گواہ ہیں کیونکہ گو سنت حدیث کی محتاج نہیں لاکھوں کروڑوں
آدمیوں کا عمل اسپر شاہد ہے لیکن حدیث یہ گواہی تو ضرور دیتی ہے کہ سنت کا تواتر رسول کریم
صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا بھی ہے یا کوئی عمل اور طریق بعد کے لوگوں کا اختراع ہے مثلاً
اس وقت کروڑوں مسلمان بدعات میں مبتلا ہیں اور وہ اپنے زعم باطل میں یہی سمجھ رہے ہیں
کہ یہ کام اسلام کا جزو ہیں اور ہمیشہ سے ہوتے چلے آئے ہیں۔ حدیث ہمیں اس امر میں مدد دیتی ہے
کہ یہ خیالات بعد میں پیدا ہوئے ہیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک انکا پہنچنا تو الگ
رہا اس زمانہ میں بھی ان رسوم کا مسلمانوں میں کچھ پتہ نہ تھا جب احادیث جمع کیجا رہی تھیں۔
اور صاحب بصیرت کیلئے وہ موجب ہدایت ہو جاتی ہیں جیسے اہل شیعہ میں تازیوں کی بد رسم ہے
کہ خود بڑے بڑے ائمہ اس رسم کو ناپسند کرتے ہیں انکی ہدایت کا موجب وہ روایات ہی ہوتی ہیں

جو احادیث کے نام سے مشہور ہیں اور انہیں سے معلوم کرتے ہیں کہ اس کام کا ثبوت ائمہ اہل بیت کے عمل سے نہیں ملتا اگر وہ روایات نہ ہوتیں تو وہ کیونکر سمجھتے کہ یہ کام حضرت امام زین العابدین کے زمانہ سے چلا آتا ہے یا بعد میں کسی نمائش پسند طبیعت نے ایجاد کر کے اپنے ہم مذاق لوگوں کی ہمدردی کو حاصل کر کے اسکا رواج عام کر دیا ہے۔

علم حدیث کا ایک اور فائدہ بھی ہے کہ یہ سنت کے متعلق ہمیں یہ علم بھی دیتا ہے کہ کونسی سنت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو زیادہ مرغوب تھی۔ بے شک نسلاً بعد نسل مسلمانوں کا طریق عمل اس امر کو تو ثابت کر سکتا تھا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کام کو کس طرح کیا یا کس کس طرح کیا لیکن یہ بات تواتر اور عمل سے نہیں معلوم ہو سکتی تھی کہ کئی طریقوں میں سے جو کام کیا گیا ہے اُن میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا زیادہ پسندیدہ کونسا طریقہ تھا یا کس طریق پر آپ خود اکثر عمل فرماتے تھے ایک سالک راہ کیلئے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عاشق کیلئے یہ علم نہائت ہی دل کو تقویت دینے والا اور معلومات کے ذخیرہ کو بڑھانیوالا ہے۔

علم حدیث کا ایک یہ بھی فائدہ ہے کہ اسکے ذریعہ سے قرآن کریم کے وہ بہت سے معارف جسے ایک عام انسان خود نہیں معلوم کر سکتا تھا بلکہ اعلیٰ درجہ کی روحانیت کے حصول کے بغیر ان پر اطلاع ہی نہیں ہو سکتی تھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے ظاہر کر دیئے گئے ہیں اور ہر ایک شخص ان سے فائدہ اُٹھا کر قرآن پر تدبر کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے مثلاً قرآن کریم میں دوزخ کا عذاب ابدی قرار دیا گیا ہے مگر اسے غیر متناہی نہیں قرار دیا گیا لیکن عام طور پر لوگ اس امر کو نہیں سمجھ سکے اور انہوں نے قرآن کریم کی آیات رحمتی وسعت کل شئی کی تہ کو نہیں پایا۔ اور نہ امہ ھاویہ کی آیت پر غور کیا کہ کیا کوئی شخص ماں کے پیٹ میں ہمیشہ رہتا ہے اور نہ یہ سوچا کہ جنت کے انعامات کی نسبت کیوں باوجود ابد کے الفاظ استعمال ہونیکے غیر مجذوذ (نہ کٹنے والے) اور غیر ممنون (نہ کٹنے والے) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں کیوں دوزخ کی نسبت یہ الفاظ استعمال نہیں ہوئے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لیأتین علی جہنم زمان لیس فیھا احد (تفسیر معالم التنزیل سورہ ہود رکوع ۹) فرما کر اس نکتہ معرفت کو جو سر خلق کی جان اور معرفت کی روح ہے ہر ایک شخص تک پہنچا دیا اب جو شخص ضد اور تعصب سے خالی ہو اس

حقیقت کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہے۔۔۔

اسی طرح مثلاً قرآن کریم میں مسیح علیہ السلام کے ایک مثیل کی خبر سورہ تحریم میں بایں الفاظ دیگئی تھی کہ وضرب اللہ مثلا للذین آمنوا امرأت فرعون اذ قالت رب ابن لی عندك بیتا فی الجنة ونجنی من فرعون وعملہ ونجنی من القوم الظالمین۔ ومریم ابنت عمران التی احصنت فرجها فنفخنا فیه من روحنا وصدقت بکلمات ربها وکانت من القانتین۔ ع ۲۔ یعنی مسلمانوں کی دو اقسام ہیں ایک تو وہ جو نیک تو ہوتے ہیں مگر کبھی بدی سے مغلوب بھی ہوجاتے ہیں اور ایک وہ جو بکلی پاک ہوتے ہیں مگر اس سے اوپر ایک ترقی کا درجہ بیان فرمایا ہے کہ یہ پاک لوگ جب اللہ تعالیٰ کی وحی سے مشرف ہوتے ہیں تو مریمی صفت سے ترقی کرکے اپنے اندر مردوں والی طاقت پیدا کر لیتے ہیں اور وہ درجہ مسیحیت کا درجہ ہے اور اس میں ایک مثیل مسیح کی خبر دی گئی ہے۔ اسی طرح سورہ زخرف کے چھٹے رکوع میں بیان فرمایا ہے۔ واذا ضرب ابن مریم مثلا اذا قومك منه یصدون۔ جب ابن مریم کو بطور مثال کے بیان کیا جاتا ہے تو تیری قوم اسپر تالیاں پیٹتی ہے سوائے اسکے کہ ایک مسیح کی آمد کی خبر دیگئی ہے اور کبھی بھی مسیح علیہ السلام کو قرآن کریم یا حدیث میں بطور مثال نہیں پیش کیا گیا پس اس میں بھی ایک مسیح کے رنگ میں رنگین شخص کی آمد کی خبر دی گئی تھی مگر اس نکتہ کو وہی سمجھ سکتا تھا جو یا تو معرفت میں ترقی یافتہ ہو یا پھر خود اس زمانہ کو پالے جسکے متعلق یہ اخبار تھیں پس رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کی ہدایت کیلئے ان الفاظ میں لوگوں کو خبر دیدی کہ آئندہ زمانہ میں مسیح کا نزول ہونیوالا ہے اگر آپ نہ بتاتے تو عوام الناس اس موعود کی انتظار ہرگز نہ کرتے اور اسکے قبول کرنیکی طرف انہیں کوئی توجہ نہ ہوتی۔ غرض احادیث قرآن کریم کے دقیق مسائل کی وہ تفسیر بھی بیان کرتی ہیں جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ کیوں خود قرآن کریم نے اس مضمون کو اس طرز پر بیان نہ کر دیا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اعتراض قلت تدبر کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ اگر اس اعتراض کی روح کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو تفاوت مدارج اور حقیقت تدبر بالکل باطل ہو جائے۔ کئی لوگ اس قدر علم بھی نہیں رکھتے کہ ان معمولی باتوں کو سمجھ سکیں جنکو علوم ظاہری رکھنے والا آدمی بھی ادنیٰ تدبر سے سمجھ سکتا ہے

لیکن جب وہ شخص ان اشخاص کو تفصیلاً سمجھاتا ہے تو وہ سمجھ لیتے ہیں۔ تو کیا کہہ سکتے ہیں کہ کیوں اللہ تعالیٰ نے انہیں الفاظ میں قرآن کریم کو نہ اتارا جنہیں صافی یا رازی نے اس مطلب کو ادا کیا ہے تاکہ سب لوگ سمجھ سکتے بے شک دوسرے انسانوں کی سمجھانے سے بعض مطالب تو حل ہو جاتے ہیں لیکن اس قدر وسعت مطالب میں نہیں رہتی جو قرآن کے الفاظ میں پائی جاتی ہے۔

غرض یہ کہ احادیث کے مجموعہ سے اسلام کی ترقی میں اور روحانیت کی زیادتی میں بہت مدد ملی ہے اور اسکے فوائد بہت سے ہیں جن میں سے چند اوپر بیان کیے گئے ہیں اور ان کے فوائد کا انکار سوائے جاہل یا متعصب انسان کے اور کوئی شخص نہیں کر سکتا۔ اور جن لوگوں نے ان کو ضبط اور جمع کیا ہے وہ ہر بہی خواہ اسلام کے شکریہ اور دعا کے مستحق ہیں جزاھم اللہ عنا وعن جمیع المسلمین۔

احادیث کے متعلق یہ امر سمجھ لینا ضروری ہے کہ وہ انسانی کوشش کا نتیجہ ہیں جو صحیح حدیث ہے وہ خدا کے رسول کا قول ہے اور جو غلط ہے اس کی غلطی انسانی علم کی کمی کے سبب سے ہے نہ حدیث کے جمع کرنیوالوں نے اپنی کوششوں کو غلطی سے پاک قرار دیا ہے اور نہ وہ غلطی سے پاک کبھی قرار دی گئی ہیں پس اسی حیثیت سے ان پر تنقید کرنی چاہیئے۔ کونسا کام انسان کا ہے جس میں غلطی نہیں ہوئی۔ پہلے زمانہ کے علوم کے بعض حصوں کو آج کی تحقیق نے باطل ثابت کر دیا ہے مگر اس سے ان علوم کے مدون کرنیوالوں کی ذات پر کوئی حرف نہیں آتا۔ موجودہ طب خواہ یونانی ہو خواہ انگریزی اس طب سے ہزاروں گنے بڑھکر ہے جو آج سے پہلے دنیا میں مروج تھی اور آئندہ زمانہ کی ترقیات موجودہ زمانہ کی طب کو بھی پیچھے چھوڑ جائینگی مگر باوجود اسکے ان لوگوں کے احسان اور ان کی شان میں ہرگز شبہ نہیں کیا جائیگا جنہوں نے آج سے دو ہزار سال پہلے طب کو مدون کیا۔ جالینوس کی سینکڑوں غلطیاں ثابت ہو جائیں پھر بھی وہ جالینوس کا جالینوس ہی رہیگا اور ہر علم دوست انسان اسکے احسان اور اسکے علم کی قدر کریگا کیونکہ سوال یہ نہیں ہے کہ جالینوس کیا جانتا تھا بلکہ سوال یہ ہے کہ جالینوس نے علم میں کس قدر زیادتی کی اور آئندہ علوم کی ترقی میں کس قدر مدد کی۔ اگر اس کی سو بات غلط ثابت

ہوجائے تو ہوجائے مگر اس ہیں کیا شبہ ہے کہ اسنے بعض باتیں ایسی دریافت کیں کہ وہ آئندہ علوم کی ترقی کیلئے بنیاد ہو گئیں پچھلی تحقیق بے شک اسکی تحقیق سے بڑھکر ہے مگر اس کی تحقیق نہ ہوتی تو یہ بعد کی تحقیق بھی نہ ہوتی۔ سقراط اپنے علم الاخلاق کے سبب اور افلاطون اپنے فلسفہ کے سبب سے ہمیشہ یاد رکھے جاوینگے گو علم الاخلاق اور فلسفہ کس قدر ہی ترقی کیوں نہ کر جائیں اور نئی تحقیق ان کی تحقیقاتوں میں ہزاروں غلطیاں کیوں نہ ثابت کردے کسی انسان پرستی کی سبب سے نہیں بلکہ اس سبب سے کہ ان کا دماغ دوسروں کیلئے تحریک کا موجب بنا اور انہوں نے ایک ایسی بنیاد رکھی جسپر اور عمارتیں تیار ہوئیں۔ ایک تاریخی کتاب کا مصنف جو سالہا سال کی عرق ریزی کے بعد ان واقعات کو جو پراگندہ طور پر ہزاروں دماغوں میں مخفی تھے یکجا اور ترتیب وار جمع کرکے ہر انسان کی پہنچ میں لے آتا ہے محض اس وجہ سے کہ اسکی تحقیق میں بعض غلطیاں رہگئی ہیں اس شخص کی نسبت حقیر نہیں قرار دیا جا سکتا جس نے واقعات نہیں جمع کئے بلکہ مصنف کی کتاب سے کسی ایک واقعہ میں غلطی نکال دی ہے کیونکہ مصنف نے اگر بشریت کے ماتحت کوئی غلطی کردی ہے تو اسنے ہزاروں جدید باتیں بھی تو ہمیں بتائی ہیں جو ہمیں پہلے معلوم نہ تھیں پھر کیا اسکی اس محنت کو ہم نظرانداز کر دینگے اور اسکی غلطی کو جو محض بشریت سے واقع ہو گئی ہے اور جس قسم کی غلطیاں اگر ہم اس کام کو کرتے جو اسنے کیا ہے اور اس زمانہ میں کرتے جس میں اسنے وہ کام کیا ہے خود ہم سے نہ صرف یہ کہ واقع ہوتیں بلکہ شائد اس سے کئی گنے زیادہ واقع ہو جاتیں اس قدر بڑھا بڑھا کر بیان کرینگے کہ اسکی ساری محنت پر پانی پھیر دینگے یقیناً اگر ہم شرافت طبع کا کوئی حصہ اپنے اندر رکھتے ہیں تو ایسا ہرگز نہیں کرینگے۔

اسی وقت کسی کے کام پر اسکو ملامت کیجاتی ہے جبکہ اسکا کام بجائے مفید معلومات کا موجب ہونیکے بجائے ترقی کی طرف لوگوں کا قدم اٹھانیکے لوگوں کے تباہ ہو جانیکا موجب ہوا ہو اور اسیوقت ہم کسی کی غلطی پر لعنت و ملامت کرنیکے حقدار ہوتے ہیں جبکہ اسنے جان بوجھکر لوگوں کو دھوکا دینے کی کوشش کی ہو یا ایک ایسی غلطی میں لوگوں کو ڈالا ہو جو اس زمانہ کی حالت کو مدنظر رکھتے ہوئے معمولی کوشش اور سعی سے دور ہو سکتی تھی یا جبکہ وہ کسی ایسے امر کو جس میں غلطی کا احتمال ہو سکتا تھا اپنے زیر اثر لوگوں کے سامنے [illegible] پیش

کرتا ہے کہ اس میں غلطی کا احتمال ہی بالکل ناممکن ہے اور نہ ایسا ہی غلطی سے پاک ہے جیسے کہ الہام الٰہی سے بتائی ہوئی تعلیم۔ ایسے شخص پر اسلئے ملامت کیجاتی ہے کہ وہ لوگوں کو علم سے محروم کرتا ہے۔ لیکن محدثین نے ایسی کونسی بات کی ہے جس پر ان کو اس قدر گالیاں دیجائیں کیا ان لوگوں کی محنت سے ہزاروں قسم کی بدعات کا قلع قمع نہیں ہوا کیا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق وعظوں کا ایک ذخیرہ انہوں نے جمع نہیں کر دیا کیا سنت کی حفاظت کا کام انہوں نے نہیں کیا۔ کیا علوم قرآنیہ کی ترویج اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فہم قرآن کی اشاعت میں انہوں نے مدد نہیں دی؟ کیا ایک اعلیٰ درجہ کی اسلامی تاریخ جس میں عام تاریخی تحقیقات سے بہت زیادہ محنت کیساتھ حالات جمع کئے گئے ہیں اور جس میں تاریخ سے بڑھکر یہ جدت ہے کہ بجائے اپنے الفاظ کے خود راوی کے الفاظ یا متکلم کے الفاظ کو بیان کرنیکی حیرت انگیز حد تک کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ انہوں نے تیار نہیں کر دی؟ پھر اس بے نظیر کوشش کے صلہ میں کیا ان کو وہی انعام ملنا چاہیئے جو مصنف کتاب نے ان کو دینا چاہا ہے۔ اور جس عطیہ پر صداقت اور احسان شناسی با آواز بلند عطائے تو بلقائے تو کے مقولہ سے اسے مخاطب کر رہی ہیں۔

وہ کونسا علم تھا جسے علم حدیث کے رواج سے نقصان پہنچا یا وہ کونسی تحقیق تھی جو اس علم کی ایجاد کیسے بند رک گئی اگر اس علم سے کوئی نقصان لوگوں کو پہنچا ہے تو اور کونسا علم ہے جسکا غلط استعمال لوگ نہیں کر لیتے۔ اگر علم حدیث کو بعض لوگوں نے تدبر فی القرآن میں روک بنا لیا ہے تو بعض دوسروں نے تدبر فی القرآن کو فہم رسول پر اپنے فہموں کو مقدم کرنے کا مترادف بنا دیا ہے پس لوگوں کے غلط استعمال سے ان ہزاروں فوائد پر پردہ نہیں ڈالا جا سکتا جو اس علم کے ذریعے حاصل کئے جا سکتے ہیں اور جو فوائد کہ اہل علم لوگوں نے ہمیشہ حاصل کئے ہیں اور جن کو وہ حاصل کر رہے ہیں۔

باوجود موضوعات کے ایک انبار کے صحیح روایات کا ایک ایسا مجموعہ موجود ہو گیا ہے جس میں ہزاروں در بے بہا ملتے ہیں بے شک ان میں کانٹے بھی ہیں لیکن کانٹوں کی موجودگی سے گلاب کے پھول کی قدر میں کمی نہیں آجاتی کون کہتا ہے کہ تم کانٹے اپنے جسم میں چبھو لو

باغ بان نے گلاب کا درخت لگایا ہے اس میں کانٹے ضرور لگینگے تم اس میں سے پھول چنو اور ان کو استعمال کرو۔ روایتیں جمع کرنیوالوں نے روایات جمع کر دی ہیں انکی تحقیقات بین تین وجوہ سے صداقت سے دور روایات شامل ہو سکتی ہیں۔ یا تو اس وجہ سے کہ انکی تحقیقات ناقص رہگئی اور ایک جھوٹا سچا بنکر ان کو کوئی بات بتا گیا۔ ۲۔ یا اس طرح کہ انہوں نے بھی دیانتداری سے کام لیا اور دوسرے نے بھی لیکن بشریت کے اثر سے غلط فہمی کے ماتحت کوئی بات اس طرح بیان کی گئی جس طرح پہلے راوی نے بیان نہ کی تھی یا جس طرح اصل واقعہ نہ ہوا تھا۔ ۳۔ یا یہ کہ انہوں نے اس خیال سے ان روایتوں کو نقل کر دیا جو ان کے نزدیک بھی کمزور تھیں تا دونوں قسم کے خیالات کو پہونچا دیں تاکہ لوگوں میں تحقیق اور تدقیق کا ملکہ پیدا ہو اور تاکہ وہ لوگوں کے دلوں پر اپنے خیالات کے جبر بیعکس ڈالنے کے مرتکب نہوں۔ اول الذکر سے پوری طرح بچ جانا تو انسانی طاقت سے بالکل بالا ہے اور آخر الذکر سے اگر بعض نقصانات بھی پہنچ جاتے ہیں تو اسکی بعض عظیم الشان فوائد سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن کریم میں جن منافقوں کی خبر دیجاتی ہے انکی شرارتوں کا نقشہ ہمارے دلوں پر کب جم سکتا تھا اگر انکی مشہور کردہ روایات کا ایک سلسلہ ہم تک نہ پہنچ جاتا۔ انکی روایتوں کا بقیہ بھی ہمیں الفاظ قرآنیہ کی حقیقت اور اس رحم اور صبر کا پتہ دیتا ہے جس سے خدا اور رسول نے منافقوں کے متعلق کام لیا۔

غرض بعض روایات کی غلطی سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ کام ہی عبث تھا اور نہ محدثین کی خدمت اسلام میں کوئی شبہ لاحق ہوتا ہے اور نہ انکی شان میں کوئی کمی آتی ہے۔ انہوں نے فوق العادت محنت سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس کے نقشہ کو ہمارے لئے محفوظ کر دیا ہے اور اگر ہم میں سے کوئی انکی بشری غلطیوں سے ٹھوکر کھاتا ہے تو یہ اسکی بدقسمتی ہے اگر وہ اس قسم کی غلطیوں سے ڈر کر اس کام کو چھوڑ دیتے تو یقیناً اللہ تعالیٰ کے حضور میں مجرم ہوتے اور ان سے پوچھا جاتا کہ کیوں انہوں نے ایک مفید علم کو زندہ گاڑ دیا۔

مصنف صاحب بہفوات کا یہ قول کہ چونکہ بعض ایسی احادیث مروی ہیں کہ جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان کے خلاف ہیں اسلئے ان کو جلا دینا چاہئے اور پھاڑ دینا چاہئے اور مٹا دینا چاہئے ان کی نہایت کم علمی اور جہالت پر دلالت کرتا ہے کیا دنیا کا یہ بھی قاعدہ ہے

کہ جس کتاب میں کوئی غلطی ہوجائے اسے جلادیا جائے یا اس حصہ کو بیچ میں سے نکالدیا جائے اگر اس طریق پر عمل کیا جائے تو دنیا سے علوم کا خاتمہ ہوجائے۔ اور یہ تو سخت بددیانتی ہے کہ مصنف کچھ لکھے اور پچھلے اسکو مٹا ڈالیں۔ اگر یہ صورت اختیار کیجائے تو کسی تصنیف پر اعتبار ہی کیا رہ سکتا ہے۔ مثلاً پچھلی طب کی کتب جو بوعلی سینا کی تصنیف ہیں ان کو موجودہ تحقیقات کے مطابق بدل دیا جائے۔ فلسفہ میں جو جدت پیدا ہوئی ہے اسکے ماتحت پچھلی فلسفہ کی کتب میں تبدیلی کردیجائے۔ گویا اپنے جاہلانہ خیالات میں تبدیلی پیدا کرنیکے سوا اور ہر ایک چیز میں تبدیلی پیدا کردیجائے۔ مصنف ہفوات نے اس قدر نہ سوچا کہ اگر پچھلے مصنفین کی کتب میں اس قسم کی تبدیلی جائز ہو تو روایت کا اعتبار کیا رہجائے اور درائت کی بنیاد کس امر پہ ہو۔ ہزاروں باتیں ہیں جو ایک زمانہ کے خیالات کی روشنی میں قبیح نظر آتی ہیں اور ایک دوسرے زمانہ کے خیالات کی روشنی میں خوبصورت اگر ہر زمانہ کے لوگ اپنے خیالات کے مطابق پچھلی کتب کو بدل لیا کریں تو باقی کیا رہجائے؟ آپکی اس تجویز پر عمل کرکے بالکل وہی حال ہو جو اس شخص کا ہوا تھا جس کی دو بیویوں میں سے ایک بوڑھی اور ایک جوان تھی؎

بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص کی دو بیویاں تھیں ایک بڑھیا تھی اور ایک جوان جب وہ عمر رسیدہ کے گھر ہوتا تو جس وقت وہ سوجاتا وہ اس خیال سے کہ یہ اپنے سیہ بال دیکھکر خیال کریگا کہ یہ عورت تو بڑھیا ہوگئی ہے اور میرے بال ابھی سیہ ہیں اسلئے میری مجالست کے قابل زیادہ جوان ہی ہے اسکے سیہ بال ایک ایک دو دو کرکے چنتی رہتی۔ اسی طرح جب وہ جوان عورت کے گھر ہوتا تو وہ بھی اس خیال سے کہ یہ اگر اپنے سفید بال دیکھیگا تو خیال کریگا کہ میں اب بوڑھا ہوگیا اب اس جوان عورت کی نسبت میری صحبت کے قابل بڑھیا عورت ہی ہے اسلئے سفید بال نوچتی رہتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ دنوں کے بعد اسکے سر اور داڑھی میں نہ سفید بال رہے اور نہ کالے۔ یہی تجویز آپ بھی کتب علمیہ کے متعلق بتاتے ہیں کہ جس قوم کو کوئی خیال اپنے عقیدہ کے خلاف کسی کتاب میں نظر آوے جھٹ اس کا اخکاک دماغ سے کردے مثلاً احادیث کی تدقیق کے متعلق اختلاف ہے بعض لوگوں کے نزدیک بعض راوی کمزور ہیں بعض کے نزدیک دوسرے مصنف ہفوات کے بتائے ہوئے اصل کے مطابق

ہر ایک فریق اپنے فہم کے خلاف جس قدر باتیں پائے ان کو کتب حدیث میں سے نکال دے حنفی جس قدر احادیث میں رفع یدین یا ہاتھ سینے پر باندھنے یا آمین بالجہر یا اور دیگر اختلافی مسائل کے متعلق اپنی رائے کے خلاف ذکر دیکھیں انکو کتب حدیث سے نکالدیں۔ اور اہل حدیث ان سب حدیثوں کا اخراج کر دیں جو حنفیوں کے مسائل کی تائید میں ہیں۔ اگر ایسا ہونے لگجائے تو آپ جانتے ہیں کہ اسکا نتیجہ کیا نکلے؟ علم بالکل مفقود ہوجائے اور تحقیق کا دروازہ بند ہوجائے اور تاریخ ایسی مسخ ہوجائے کہ سو سال پہلی بات کا معلوم کرنا بھی بالکل ناممکن ہوجائے اور بددیانتی اور خیانت کا دروازہ اتنا وسیع ہوجائے کہ اس کا بند کرنا حد امکان سے نکلجائے۔

ہر شخص کا اختیار ہے کہ جس بات کو ناپسند کرے رد کردے لیکن کسی کو یہ اختیار نہیں کہ مصنف کے بیان میں کمی بیشی کردے۔ اگر کسیکو بخاری کی اکثر احادیث غلط نظر آتی ہیں تو وہ ان کو رد کرسکتا ہے مگر امام بخاری کی تصنیف میں سے اپنے مطلب کے خلاف باتیں نکال کر ایک نئی صورت میں اسکو بدلدینا ہرگز جائز نہیں بلکہ یہ ایک ایسی خیانت ہے۔ ایک ایسا فریب ہے جسکو صرف کوئی سیہ باطن اور جاہل انسان ہی جائز قرار دے سکتا ہے۔

ایک اور خطرناک نتیجہ بھی اس جاہلانہ تجویز پر عمل کرنے سے پیدا ہوسکتا ہے اور وہ یہ کہ ایسے زمانوں میں جبکہ کسی قوم پر فترۃ کا زمانہ آیا ہوا ہو اور جہالت اسکے میدانوں میں ڈیرے ڈالے ہوئے ہو تمام صداقتیں باطل ہوسکتی ہیں۔ اگر مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے لوگ پچھلی چند صدیوں میں جبکہ شرک کا دور دورہ تھا تمام ایسی احادیث کتب حدیث سے نکالکر پھینکدیتے جن میں شرک کا رد ہے بلکہ بعض لوگوں کے اس خیال پر عمل کرکے کہ قرآن کریم میں بھی کچھ زیادتی ہوگئی ہے جس قدر آیات شرک اور رسوم اور بدعات کے خلاف دیکھتے ان کو نکالدیتے تو نتیجہ کیا ہوتا؟ اسلام کا کیا باقی رہجاتا وہ لوگ دیانتداری سے اپنے عقیدہ کے مطابق کام کرتے لیکن اسکا نتیجہ حق اور راستی کے خلاف کیسا خطرناک ہوتا۔ اس زمانہ میں تعلیمیافتہ لوگ کثرت ازدواج۔ طلاق اور پردہ کو اپنی عقل کے مطابق تہذیب و شائستگی کے خلاف سمجھتے ہیں۔ کیا ان کا اختیار ہونا چاہئے کہ وہ قرآن و حدیث سے ایسے تمام مضامین کو

یہ کہکر نکال ڈالیں کہ ایسی باتیں خدا اور رسول کب کہہ سکتے تھے نتیجہ یہ ہوتا کہ چند دنوں کے بعد جسکے آثار ابھی سے شروع ہو گئے ہیں جب دنیا کو معلوم ہوتا کہ یہی طریق مناسب تھا تو وہ ان احکاک شدہ اور احراق شدہ آیتوں اور حدیثوں کو قرآن کریم میں نہ پاکر اسکو ایک نامکمل اور بے معنی کتاب سمجھتے۔ ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ تمام عالم اسلام اس مرض میں مبتلا تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ آسمان پر بیٹھے ہیں۔ اگر وہ لوگ تمام آیات قرآنیہ اور احادیث کو جو انکی وفات پر دلالت کرتی ہیں نکالدیتے کہ ایسا خلاف واقعہ امر قرآن اور حدیث میں کہاں سے آسکتا تھا ضرور کسی مفسد نے پیچھے سے ملا دیا ہے تو کیا دنیا ایک صداقت سے اور اسلام ایک خوبی سے محروم ہو جاتا ہو زمانہ کے حالات بدلتے رہتے ہیں اور لوگوں کے نقطۂ نگہ تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ ایک وقت میں ایک بات جو بالکل خلاف تہذیب سمجھی جاتی ہے دوسرے وقت میں عقل وعلم کی ترقی کے ساتھ وہی معقول اور مفید ثابت ہو جاتی ہے یا کبھی اسکے خلاف ایک وقت میں ایک بات اچھی سمجھی جاکر دوسرے وقت میں بری خیال کیجانے لگتی ہے۔ اگر مصنف ہفوات کے مجوزہ طریق احکاک واحراق پر عمل کیا جائے تو ہزاروں صداقتیں جہالت اور فترۃ کے زمانہ میں مٹا دی جائیں۔ اور سچے مذہب کے پیرووں کو تحقیق وتدقیق کے زمانہ میں دوسرے مذہب کے پیرووں کے سامنے منہ دکھانے کی گنجائش نہ رہے۔ اسوقت جو پچھلے لوگوں کی تحقیق کی بعض غلطیاں معلوم ہوتی ہیں تو کیا اسی سبب سے نہیں کہ انہوں نے دیانتداری سے اپنی فہم کے خلاف خیالات کو باقی رہنے دیا بلکہ خود محفوظ کر دیا تاکہ تحقیق کا دروازہ بند نہ ہو جائے۔ اگر وہ لوگ بھی اس احکاک اور احراق کے طریق کو اختیار کرتے تو آج ہمارے لئے صداقت کے معلوم کرنے کا کونسا رستہ کھلا رہجاتا؟

خلاصۂ کلام یہ کہ مصنف ہفوات کا احراق واحکاک کا مشورہ خیرخواہی ونیک طلبی کیوجہ سے نہیں ہے بلکہ محض ان لوگوں کے کام پر پردہ ڈالنے کیلئے ہے جنہوں نے خدمت اسلام میں رات اور دن کو ایک کر دیا۔ اگر مصنف ہفوات یہ مشورہ نہ دیتے بلکہ سیدھی طرح یہ بات کہدیتے کہ باوجود ان لوگوں کی کوششوں کے بعض کوتاہیاں بھی ہو گئی ہیں تو ان کو خوف تھا کہ اسطرح لوگوں کے دل سے محدثین کی عظمت نہ مٹیگی اور وہ کہدینگے کہ ہاں انسان سے غلطی ہو جاتی ہے

اور یہ بات پہلے بھی مسلمان مانتے ہی تھے کہ محدثین غلطی سے پاک نہیں ہیں۔ بعض دفعہ انہوں نے ایک حدیث کو صحیح سمجھا ہے اور وہ بعد میں صحیح ثابت نہیں ہوئی۔ اور بعض دفعہ انہوں نے ایک حدیث کو کمزور سمجھا ہے اور وہ بعد میں کمزور ثابت نہیں ہوئی۔ پس انہوں نے ایسے الفاظ استعمال کئے جن سے دوسروں پر تو کچھ اثر ہو یا نہ ہو مگر ان کا بغض نکل گیا اور اپنی اس عادت سب وشتم کو جو گردو پیش کے اثرات سے متاثر ہو کر طبیعت ثانی ہو چکی ہے انہوں نے پورا کر لیا مگر کیا چاند پر تھوکنے سے۔ چاند کا کچھ بگڑتا ہے؟ تھوکنے والے کے منہ پر تھوک آپڑتا ہے اور ایسی فضیحت ہوتی ہے۔

میرے نزدیک مصنف ہفوات کا یہ طریق سب وشتم زمانہ کے حالات کو مدنظر رکھکر بھی نہایت خطرناک ہے اس وقت مختلف قسم کے مصائب اور آلام نے مسلمانوں پر یہ روشن کر دیا ہے کہ خواہ ان میں مذہبی طور پر کس قدر ہی اختلاف کیوں نہ ہو ان کو اپنی ہستی کے قیام کیلئے ضروری ہے کہ ایکدوسرے پر بیجا حملہ کر کے موانست اور مواسات کے تعلقات کو قطع نہ کریں۔ اختلاف مذہب کو قربان نہیں کیا جاسکتا لیکن اس اختلاف کے اظہار کا طریق یہ نہیں کہ ایکدوسرے کے بزرگوں کو گالیاں دیجاویں۔ اگر ہم ایسے مذاہب کے بزرگوں کا بھی ادب کر سکتے ہیں جنکے ساتھ ہمیں نہایت کم وجۂ اشتراک پائی جاتی ہے تو ایک کتاب کو ماننے والے اور ایک رسول کی امت کہلانے والے لوگوں کو جو دوسری کسی قوم میں بزرگ مانے جاتے ہوں کیوں ادب سے یاد نہیں کر سکتے۔ اس وقت تک اسلام کو کافی نقصان اس قسم کے اختلافات سے پہونچ چکا ہے اور اور اگر باوجود خدا تعالیٰ کے قہری نشانوں کے اب بھی دشمنی اور عداوت کے بے محل استعمال کو نہ ترک کیا گیا تو اس رویہ کے اختیار کرنے والے افراد اور ان کے افعال پر خوش ہونیوالی جماعتیں ایک ایسا روز بد دیکھیں گی کہ دشمنوں کو بھی ان پر رونا آئیگا۔

میرا یہ مطلب نہیں کہ شیعہ سنی اور دیگر ناموں سے یاد کئے جانیوالے فرقے اپنے مذہب کی تبلیغ نہ کریں۔ میرا طریق عمل میرے قول سے زیادہ اس خیال کو رد کر رہا ہے کیونکہ تبلیغی لحاظ سے اس جماعت نے کہ جس کا امیر اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنے فضل سے بنایا ہوا ہے تمام دنیا میں اپنی تبلیغی کوششوں کے ذریعہ سے حیرت انگیز حرکت پیدا کر رکھی ہے۔ بلکہ میرا یہ مطلب ہے کہ اپنے اپنے محاسن اور خوبیاں بیان کی جائیں اور دوسروں پر بلاوجہ اور بلا ان کی

طرف سے حملہ ہونیکے حملہ نہ کیا جائے ۔ اور اس حدیث کو یاد رکھا جائے قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من الکبائر شتم الرجل والدیہ قالوا یا رسول اللہ وھل یشتم الرجل والدیہ قال نعم یسبّ ابا الرجل فیسب اباہ و یسبّ امہ فیسبّ امہ ۔ ترجمہ رسول کریم صلی اللہ (عن عبداللہ بن عمر بخاری و مسلم) علیہ وسلم نے فرمایا بڑے گناہوں میں سے ایک اپنے ماں باپ کو گالیاں دینا بھی ہے ۔ لوگوں نے کہا یا رسول اللہ کیا کوئی اپنے ماں باپ کو بھی گالیاں دیتا ہے ؟ آپ نے فرمایا ہاں کسیکے باپ کو گالیاں دیتا ہے پھر وہ اس کے باپ کو گالیاں دیتا ہے ۔ یا کسی کی ماں کو گالی دیتا ہے پھر وہ اسکی ماں کو گالی دیتا ہے یعنی دوسرے کے ماں باپ کو گالیاں دیکر اپنے ماں باپ کو گالیاں دلوانا ایسا ہی ہے جیسا اپنے ماں باپ کو خود گالیاں دے لینا ۔

جن لوگوں کو کوئی قوم اپنے روحانی ہادیوں میں سمجھتی ہے انکی عزت اپنی ماں باپ سے زیادہ کرتی ہے انکی نسبت بلا وجہ گندے الفاظ استعمال کرنیکا لازمی نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ اس کے بزرگوں کو گالیاں دیں اور اس صورت میں اکسانے والا ہی اپنے بزرگوں کو گالیاں دینے والا سمجھا جائیگا ۔ خصوصًا جب صورت ایسی ہو کہ ایک قوم کے بزرگ دوسری قوم کے نزدیک بھی بزرگ ہوں تب تو اس دوسری قوم کے بزرگوں کو گالیاں دینا نہ صرف برا ہے بلکہ حد درجہ کی کمینگی کا مظہر ہے کیونکہ ایسا شخص اس امر سے کہ دوسری قوم کے لوگ اسکے بزرگوں کو بھی اپنا بزرگ خیال کرتے ہیں اور اسکی سختی کا سختی سے جواب نہیں دے سکتے ناجائز فائدہ اُٹھاتا ہے اور بارہا دیکھا گیا ہے کہ ان لوگوں کو جو اسکے بزرگوں کو اپنا بزرگ خیال کرتے تھے وہ اپنی ناشائستہ حرکت سے ایسا مجبور کر دیتا ہے کہ ان میں سے بعض لیطور بدلے کے ان بزرگوں کو بُرا بھلا کہنے لگجاتے ہیں اور یہ شخص ایک دوست کو دشمن بنانے کا عذاب مزید براں اپنے اوپر نازل کر لیتا ہے ۔

غرض سب و شتم ایک قبیح فعل ہے اور دوسروں کے بزرگوں کو گالیاں دینے والا سخت مجرم ہے اور اگر اس کی زیادتی کے سبب سے دوسری قوم کے لوگ بھی اپنی زبان کھولیں تو اس کا الزام ان پر نہیں بلکہ اس گالیاں دینے والے کے ذمہ ہے اور میں یقین کرتا ہوں کہ اہل شیعہ کے

شرفاء اور رؤساء مصنف ہفوات کی بدکلامیوں اور بلا وجہ کی چھیڑ چھاڑ کو اسی طرح برا سمجھینگے جس طرح کہ دوسرے فریق کو اسکا فعل برا معلوم ہوا ہے۔ اور ہونا چاہیئے۔

مصنف ہفوات کو جو بغض ائمہ اسلام سے ہے وہ مندرجہ ذیل عبارت سے بخوبی ظاہر ہے وہ لکھتے ہیں "یہ امر ممکن تھا کہ ہم کتب عقاید و اصول حدیث و رجال سے بھی ایسی احادیث کو مجروح و مقدوح کر دیتے لیکن جب یہ مسلمات عقلی ہے کہ راوی کی ثقاہت متن حدیث کی صحت کو مستلزم نہیں اور نہ خلاف قرآن حدیث حجت ہے اور نہ وہ ہفوات درایت کی معیار پر کھری ہیں اسلئے اس بیکار رطول کو ترک کر دیا" یعنی گو خود ان اصول کے مطابق جو اہل اسلام نے مقرر کئے ہیں اور خود ان قواعد کے مطابق جو ائمہ حدیث نے تجویز کئے ہیں ایسی احادیث کی کمزوری ثابت ہو سکتی تھی مگر یہ ایک بیکار رطول تھا اسلئے مصنف ہفوات نے اسکو ترک کر دیا۔ مگر ہر ایک عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ یہ ایک بیکار رطول نہ تھا بلکہ اگر یہ ثابت ہو جاتا کہ خود ائمہ حدیث نے ایسے قواعد تجویز کئے ہیں جن سے صحیح اور کمزور حدیثوں میں فرق کیا جائے تو لوگ سمجھ جاتے کہ حدیثوں کو کلام الہی کیطرح مسلمان غلطی سے پاک نہیں مانتے۔ اور اگر خود انہی ائمہ کے بنائے ہوئے قواعد کے مطابق بعض احادیث ضعیف ثابت ہو جائیں تو ان کے ذریعہ سے ائمہ حدیث کو گالیاں دینے کا موقع نہیں مل سکتا تھا پس بیکار رطول سے بچنے کیلئے نہیں بلکہ اپنی سب و شتم کی عادت کو پورا کرنے کیلئے مصنف ہفوات نے اس طریق کو اختیار کیا ہے اور یہ بات ان کے دلی تعصب پر ایک شاہد ناطق ہے۔

اس تمہیدی نوٹ کے بعد میں ایک ایک کر کے مصنف صاحب ہفوات کے اعتراضات کے متعلق اپنی تحقیق بیان کرتا ہوں لیکن ایک دفعہ پھر کھول کر کہدینا چاہتا ہوں کہ کتب احادیث کے مؤلفوں کو نہ خود دعوی ہے کہ وہ غلطی سے پاک ہیں اور نہ کبھی مسلمانوں کو یہ دعوی ہوا ہے کہ ان سے کسی قسم کی غلطی نہیں ہوئی بلکہ ان کی نسبت یہی خیال علماء میں رائج چلا آیا ہے کہ وہ بعض خدام اسلام کی دیانت ارادہ اور ان تھک کوششوں کا خوبصورت اور دل آویز نتیجہ ہیں جس میں گو بعض کمیاں رہ گئی ہوں لیکن ان کے ذریعہ سے جو فائدہ دنیا کو پہونچا ہے یا پہنچتا ہے یا پہنچ سکتا ہے اس کی قیمت کا اندازہ لگانا ہمارے لئے مشکل ہے اور اللہ تعالی ہی ان لوگوں کی

نیک خدمات کا بدلہ ان کو دیگا۔

پہلا اعتراض

حدیث قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم حبب الی من الدنیا النساء والطیب نقل کرکے آپنے اعتراض کیا ہے "مسلمانوں کو کسی کنھیا پرست نے یہ عبارت دی اور انہوں نے اس زٹل کو حدیث سمجھ لیا۔ دیکھئے رسول کی شان یہ ہے کہ معرفت الٰہی اور ہدایت خلق اور اجرائے احکام خدامیں زیادہ خوش ہو نہ کہ عورتوں اور اسکے لوازم خوشبو سے" ہفوات صفحہ ۴۔

حیرت پر حیرت اور تعجب پر تعجب ہوتا ہے کہ کیسی اعلیٰ اور اکمل تعلیم روحانی دینے والی حدیث اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقی شان کو ظاہر کرنیوالی روایت کو مصنف ہفوات نے احکاک اور احراق کیلئے چنا ہے اور اسپر ایک بہت گندہ اعتراض کیا ہے۔ اگر اس قسم کے فہم اور اس قسم کی سمجھ پر کتب روایات کا احکاک اور احراق شروع ہوا تو یقیناً صحیح احادیث کا ملنا مشکل ہو جائے گا۔

اس اعتراض کا جواب تین سوالوں کا جواب دینے سے ہو سکتا ہے۔ اوّل تو یہ کہ کیا جو معنی اس حدیث کے مصنف ہفوات نے سمجھے ہیں وہ درست اور صحیح ہیں؟ دوم یہ کہ کیا عورتوں سے محبت کرنا اور حلال اشیاء سے محبت کرنا ایمان یا روحانیت کے منافی ہے؟ سوم یہ کہ اس حدیث کے اصل معنے کیا ہیں؟۔

اس سوال کا جواب کہ کیا اس حدیث کے وہی معنے ہیں جو مصنف ہفوات نے سمجھے ہیں نفی میں ہے۔ ہر شخص کی نظر اسکے اپنے تقویٰ اور معرفت کی حد تک ہی جاتی ہے اور مصنف ہفوات اس قسم کی بات لکھنے پر مجبور ہے۔ مگر حق یہ ہے کہ اس حدیث کے ہرگز وہ معنی نہیں جو مصنف ہفوات نے سمجھے ہیں مصنف ہفوات کا یہ خیال ہے کہ اس حدیث میں یہ بتایا گیا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم عورتوں کی صحبت ہی میں وقت گذار دیتے تھے اور معرفت الٰہی اور ہدایت خلق اور اجرائے احکام میں آپکو خوشی حاصل نہ ہوتی تھی۔ اس سے زیادہ بعید معنے اس حدیث کے اور کوئی نہیں ہو سکتے۔ نہ تو الفاظ حدیث میں یہ ذکر ہے کہ آپ عورتوں کی صحبت میں وقت گذارتے تھے اور نہ اس میں یہ کہیں ذکر ہے کہ رسول کریم

صلی اللہ علیہ وسلم دین و دنیا کی چیزوں میں سب سے زیادہ عورتوں سے اور خوشبو سے محبت کرتے تھے۔ پس اس حدیث سے یہ مطلب نکالنا کہ آپ کو خدا تعالیٰ اور اسکے دین کی باتوں میں خوشی حاصل نہ ہوتی تھی یا عورتوں کی نسبت سے کم خوش ہوتے تھے۔کسی صورت میں جائز نہیں۔ اور محض ہفوات میں داخل ہے۔ یہ معنے ایسے ہی ہیں جیسے کوئی شخص کسی دوست سے کہے کہ مجھے تم سے بہت محبت ہے۔ اور آگے سے کوئی عقل کا کورا یہ سمجھ لے کہ یہ شخص اپنے والدین کا نافرمان ہے ان سے اسکو محبت نہیں ہے یا اس شخص کی نسبت ان سے کم محبت ہے۔ جبکہ ایک لفظ بھی حدیث میں ایسا نہیں ہے جسکے یہ معنی ہوں کہ عورتوں اور خوشبو کی محبت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو باقی سب چیزوں سے زیادہ تھی۔ تو مصنف ہفوات کے کئے ہوئے معنی الفاظ حدیث سے کیونکر پیدا ہوئے۔ ہم تو دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم میں کل کا لفظ بھی استعمال ہوتا ہے تو اس سے مراد بعض ہوتا ہے۔ جیسے ملکہ سبا کی نسبت آیا۔ واوتیت من کل شئ۔ اسکو ہر ایک چیز دیگئی تھی۔ حالانکہ ایک چھوٹا سا ملک اسکو ملا تھا۔ نہ دنیا کی سب قسم کی نعمتیں اسکو حاصل تھیں اور نہ دین ہی اسکو حاصل تھا۔ پس جبکہ کل کا لفظ استعمال کر کے بھی بعض کے معنے ہوتے ہیں تو جہاں بالکل ہی کوئی لفظ حصر کے لئے استعمال نہیں ہوا ہو وہاں یہ معنی کرنا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سب ماسوا پر عورتیں اور خوشبو محبوب تھی۔ کس طرح جائز ہو سکتا ہے؟

دوسرا پہلو مصنف ہفوات کے اعتراض پر غور کرنیکا یہ ہے کہ کیا عورتوں سے محبت رکھنا اور خوشبو کو پسند کرنا گناہ ہے یا روحانی ترقی کے حصول کے منافی ہے۔ اور اہل اللہ کے طریق سے نہیں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ کسی شئے کی محبت تین طرح کی ہوتی ہے یا تو ایسی محبت کہ دوسری اشیاء کو بالکل بھلا دے۔ یا ایسی محبت جو دوسری اشیاء کی محبت کے ساتھ دل میں رہے۔ اور کسی اور محبت کی طفیل سے پیدا ہو۔ یا ایسی محبت جو محب کو مغلوب تو نہ کردے لیکن مستقل محبت ہو جسے دوسرے الفاظ میں طبعی محبت کہنا چاہیئے۔ جو محبت کہ دوسرے تعلقات بھلا دیتی ہے اور ان کو نظر میں ادنیٰ اور حقیر کر کے دکھاتی ہے وہ تو ماسوی اللہ سے ناجائز ہے اور گناہ ہے لیکن ایسی محبت جو تابع ہو اللہ تعالیٰ کی محبت کے۔ اور اسکی محبت کے نتیجہ میں پیدا ہوئی ہو

وہ عین ثواب اور موجب زیادتی ایمان اور ترقی درجات ہوتی ہے۔ اور وہ محبت جو نہ تو اللہ تعالےٰ کی وحی اور حکم کے ماتحت پیدا ہوا ور نہ ماسوا پر غالب ہو بلکہ حدود کے اندر رہے یہ محبت طبعی محبت کہلاتی ہے اور جائز وحلال ہے۔ گو موجب ثواب اور باعث ترقی درجات نہیں ہاں یہی محبت نیک اور باخدا انسان کے اندر ترقی کرتے کرتے دوسری قسم کی محبت بنجاتی ہے۔ پس محبت تو نہ نیکی کے منافی ہے نہ نبوت ورسالت کی شان کے خلاف۔ بلکہ بعض وقت تقوٰی کے خلاف ہوتی ہے اور بعض وقت نہ خلاف نہ مطابق اور بعض وقت عین تقوٰی میں داخل ہوتی ہے۔

ان تین قسم کی محبتوں کا ثبوت قرآن کریم سے ملتا ہے چنانچہ سورۂ بقر میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ ومن الناس من یتخذ من دون اللہ انداداً یحبونھم کحب اللہ ط والذین امنوا اشد حبا للہ۔ ع ۲۰۔ ترجمہ۔ اور لوگوں میں سے ایک جماعت ایسی ہے جو اللہ کے شریک بناتے ہیں اور ان سے ایسی محبت کرتے ہیں جس طرح اللہ تعالیٰ سے محبت کرنی چاہئیے اور مومن سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہیں۔ اسجگہ دو محبتوں کا ذکر ہے۔ ایک جس میں ماسوا کی محبت وہ رنگ اختیار کر لیتی ہے جو اللہ تعالےٰ کی محبت میں ہونا چاہئیے۔ اسکو ناپسند اور ناجائز فرمایا ہے۔ اور ایک محبت وہ بیان فرمائی ہے کہ گو دوسروں کی محبت بھی دل میں ہوتی تو ہے مگر اللہ تعالیٰ کی محبت سے کم ہوتی ہے۔ اور اس سے ادنیٰ درجہ پر ہوتی ہے۔ اسیطرح سورہ توبہ میں فرماتا ہے قل ان کان اٰباؤکم واخوانکم وازواجکم وعشیرتکم و اموال اقترفتموھا وتجارۃ تخشون کسادھا ومسٰکن ترضونھا احب الیکم من اللہ و رسولہ وجھاد فی سبیلہ فتربصوا حتی یاتی اللہ بامرہ و اللہ لا یھدی القوم الفاسقین۔ ع ۳۔ ترجمہ:۔ کہدے کہ اگر تمہارے باپ دادے اور بیٹے اور بھائی اور بیویاں اور مال جو تمنے کمائے ہیں اور تجارت جس کے ماند پڑ جانیکا تمہیں ڈر ہے اور گھر جنکو تم پسند کرتے ہو تمہیں اللہ اور اسکے رسول اور اسکے رستے میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں تو انتظار کرو یہانتک کہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ صادر ہو اور اللہ فاسقوں کو کبھی کامیاب نہیں کرتا۔ اس آیت سے بھی ظاہر ہے کہ محبت دو قسم کی ہے ایک وہ جو حرام ہے

جو خدا اور رسول کی محبت اور خدمت دین کی خواہش پر غالب آجاوے اور اس میں سستی پیدا کردے۔ اور ایک جو جائز ہے یعنی جو اللہ تعالیٰ اور رسول کی محبت سے ادنیٰ درجہ پر ہو اور خدمت دینی کے رستہ میں روک نہو۔

تیسری قسم کی محبت جو اہل اللہ اور انبیاء اور رسل کی محبت ہے اس کا ذکر قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیات میں ہے:۔

لیس البر ان تولوا وجوھکم قبل المشرق والمغرب ولکن البر من اٰمن باللہ والیوم الاٰخر والملائکۃ والکتٰب والنبیّن واٰتی المال علیٰ حبّہ ذوی القربیٰ والیتامیٰ والمساکین وابن السبیل والسائلین وفی الرقاب سورہ بقرہ ۔۲۲۔ ترجمہ۔ نیکی تمہارے مشرق و مغرب کی طرف منہ پھیرنے کا نام نہیں ہے۔ لیکن سچی نیکی اس شخص کی نیکی ہے جو اللہ اور یوم آخر پر اور فرشتوں اور کتابوں اور نبیوں پر ایمان لاتا ہے اور اللہ کی محبت کی وجہ سے اپنے قریبیوں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں پر اور لوگوں کے چھڑانے پر خرچ کرتا ہے جو مالی یا جسمانی قید میں گرفتار ہوتے ہیں۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ مومن کی محبت اپنے عزیزوں اور قریبیوں سے بھی اللہ کی محبت کے باعث ہوتی ہے اور اسکے سب رشتہ دار طبعی محبت کے علاوہ للٰہی محبت کی رسّی سے بندھے ہوتے ہیں۔

دوسری آیت جس میں اس مضمون کو بیان کیا گیا ہے یہ ہے۔ اذ عرض علیہ الصافنات الجیاد ۝ فقال انی احببت حب الخیر عن ذکر ربی حتیٰ توارت بالحجاب ۝ ردوھا علیّ فطفق مسحا بالسوق والاعناق۔ ص ز ع ۳۔ ترجمہ۔ جبکہ اسکے (حضرت سلیمان علیہ السلام کے) سامنے سے نہایت اعلیٰ تین سموں پر کھڑے ہونے والے تیز دوڑنیوالے گھوڑے گذارے گئے تو انہوں نے بار بار کہا کہ میں ان دنیاوی سامانوں سے اپنے رب کی یاد کے سبب سے محبت کرتا ہوں (ذاتی محبت نہیں ہے) یہاں تک کہ جب وہ گھوڑے نظر سے دور ہو گئے تو حکم دیا کہ اُن کو میرے پاس واپس لاؤ اور ان کی پنڈلیوں اور گردنوں پر ہاتھ پھیرنے لگے (جیسا کہ پیار سے جانوروں پر ہاتھ پھیرا جاتا ہے)۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام گھوڑوں سے محبت رکھتے تھے اور اسکی وجہ ان کی طبعی یا جسمانی لذتیں نہ تھیں بلکہ محض اللہ تعالیٰ کے ذکر کے قیام کیلئے وہ ایسا کرتے تھے۔ کیونکہ گھوڑوں کے ذریعہ ان کو جہاد فی سبیل اللہ میں مدد ملتی تھی پس ذکر محبوب کے قیام میں ممد ہونے کے سبب وہ آپکو پیارے تھے۔

مذکورہ بالا آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک محبت ایسی بھی ہوتی ہے کہ وہ کسی دوسری محبت کے طفیل میں ہوتی ہے اور ایسی محبت اصل محبت کے راستہ میں روک نہیں ہوتی بلکہ اسکی گہرائی اور عظمت پر دلالت کرتی ہے۔

اس قسم کی محبت کا ذکر قرآن کریم میں صحابہ کے متعلق آیا ہے۔ سورۂ حشر میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ والذین تبوؤا الدار والایمان من قبلھم یحبون من ھاجر الیھم و لا یجدون فی صدورھم حاجۃ مما اوتوا ویوثرون علی انفسھم ولو کان بھم خصاصۃ ومن یوق شح نفسہ فاولئک ھم المفلحون ۔ ع ۔ ترجمہ ۔ اور وہ لوگ جو مہاجرین کی آمد سے پہلے مدینہ دار الہجرت میں رہتے تھے اور جنہوں نے ایمان کو اختیار کیا ہوا تھا وہ محبت کرتے ہیں ان سے جو ان کی طرف ہجرت کر کے آئے ہیں اور اس مال کی رغبت نہیں کرتے جو ان کو دیا جاتا ہے اور مہاجرین کو اپنی جانوں پر مقدم کر لیتے ہیں گو خود ان کو بھوک کی تکالیف ہی کیوں نہ ہو اور جو لوگ بخل نفس سے بچائے جاتے ہیں وہ کامیاب ہونیوالے ہیں۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ آپس میں ایکدوسرے سے اللہ کیلئے محبت کرتے تھے اور انکا یہ فعل اللہ تعالیٰ کو محبوب تھا اور وہ اسکی تعریف فرماتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ قرآن کریم سے تین قسم کی محبتوں کا ثبوت ملتا ہے۔ ایک وہ محبت جو بُری ہوتی ہے۔ دوسری وہ جو طبعی ہوتی ہے۔ نہ اچھی نہ بُری تیسری وہ جو موجب ثواب ہوتی ہے اور اس کا کرنیوالا اللہ تعالےٰ کا محبوب ہوتا ہے کیونکہ وہ طفیلی محبت ہوتی ہے اور خدا کی محبت کا نتیجہ ہوتی ہے پس وہ غیر کی محبت نہیں ہوتی بلکہ اللہ تعالیٰ کی ہی محبت ہوتی ہے اور اُسی کے حکم اور اُسکی رضا کے ماتحت ہوتی ہے۔ اس تیسری قسم کی محبت کا کسی اعلیٰ سے اعلیٰ انسان میں بھی پایا جانا اس کی شان کے خلاف نہیں ہے بلکہ اس کا نہ پایا جانا اس کی شان کے

خلاف ہے۔ کیونکہ اس محبت کی کمی کے یہ معنی ہونگے کہ اس کی محبت اللہ تعالیٰ سے ایسی بڑھی ہوئی نہیں کہ وہ اس کی خاطر دوسروں سے بھی محبت کر سکے۔ یہ محبت جس قدر بھی کوئی اعلیٰ مرتبہ کا انسان ہو اسیقدر اس میں زیادہ پائی جائے گی پس رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی نسبت اگر یہ بیان کیا جائے کہ آپ اپنی عورتوں سے محبت کرتے تھے تو یہ ہرگز آپ کی شان کے گھٹانیوالی بات نہیں ہے۔ آپکا یہ فعل اللہ تعالیٰ کے احکام اور اسکی منشاء کے بالکل مطابق تھا جیسا کہ وہ فرماتا ہے۔ ومن ایاتہ ان خلق لکم من انفسکم ازواجاً لتسکنوا الیھا وجعل بینکم مودۃ ورحمۃ ط ان فی ذٰلک لاٰیٰت لقوم یتفکرون (روم ۳) ترجمہ۔ اور اسکی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اسنے تمہارے لئے تمہاری ہی قسم کے جوڑے پیدا کئے تاکہ تم ان کی طرف مائل ہو کر تسلی پکڑو اور پھر تمہارے درمیان محبت اور رحمت کا سلسلہ بنایا ہے اس میں ان لوگوں کیلئے نشان ہے جو اپنے نفوس میں غور کرنیکے عادی ہیں۔ مصنف ہفوات اگر اپنے نفس میں غور کرنیکے عادی ہوتے تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ عورت و مرد کا تعلق صرف شہوات کی وجہ سے نہیں ہوتا بلکہ اسکے اندر اللہ تعالےٰ نے بہت سی حکمتیں رکھی ہیں۔ مگر ہر شخص اپنے اوپر دوسروں کی حالت کا بھی قیاس کر لیتا ہے۔

علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ازواج مطہرہ کو ایک عظیم الشان نعمت قرار دیا ہے اور جنت میں مومن مرد کے پاس اسکی مومن بیوی کو رکھنے کا وعدہ فرمایا ہے اور مسلمانوں کو دعا سکھائی ہے کہ وہ اپنی بیویوں کے قرۃ عین بننے کی دعا کرتے رہیں۔

پس اللہ تعالیٰ کے حکم اور اسکے منشاء کے مطابق پاک بیویوں کو ایک نعمت سمجھنا اور انکی قدر کرنا اور ان سے محبت کرنا ایک اعلیٰ درجہ کی نیکی ہے اور نیکی کا وجود نیکوں کی شان کو بڑھاتا ہے نہ کہ گھٹاتا ہے۔

تیسرا پہلو مصنف ہفوات کے سوال پر غور کرنیکا یہ ہے کہ اس حدیث کے اصل معنوں پر غور کیا جائے کیونکہ بہت دفعہ انسان ایک بات کے معنے غلط کر کے اعتراض کر دیتا ہے لیکن صحیح معنے معلوم ہوں تو اعتراض دور ہو جاتا ہے میرے نزدیک اسی حدیث کے صحیح معنے معلوم نہ ہونے کے سبب سے ہی مصنف ہفوات کو اعتراض پیدا ہوا ہی بلکہ مصنف ہفوات سے ایک خطرناک غلطی یہ ہوئی ہے

کہ انہوں نے یہ کوشش کی ہے کہ صحیح معنے معلوم نہ ہوسکیں اور حدیث کا ایک ٹکڑا اس غرض سے محذوف کر دیا ہے۔ گو اصل معنی اس حدیث کے جب میں بیان کرونگا تب معلوم ہونگے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ حدیث کو پورا نقل کر دینے سے ہر شخص سمجھ لیگا کہ مصنف ہفوات نے دیانتداری سے کام نہیں لیا کیونکہ انہوں نے حدیث کا وہ حصہ جو اس اعتراض کو جو انہوں نے کیا ہے بالکل دور کر دیتا ہے چھوڑ دیا ہے۔

حدیث کے اصل لفظ یہ ہیں حدثنا سلام ابو المنذر عن ثابت عن انس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حُبِّبَ اِلَیَّ من الدنیا النساء والطیب وجُعِلَ قُرَّۃُ عینی فی الصلوٰۃ۔ ایک دوسری روایت ہے من دنیاکم۔ ترجمہ۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے پسند کرائی گئی ہیں تمہاری دنیا میں سے عورتیں اور خوشبو اور **میری آنکھوں کی ٹھنڈک تو نماز ہی میں رکھی گئی ہے**۔ اس آخری فقرہ کی موجودگی میں کیا مصنف ہفوات کا اعتراض پڑ سکتا تھا کہ یہ رسول کی یہ شان ہے کہ وہ معرفت الٰہی اور ہدایت خلق اور اجرائے احکام خدا میں زیادہ خوش ہو نہ کہ عورتوں اور اُسکے لوازم خوشبو سے معاذ اللہ صفحہ ۴۔ پس انکا اس فقرہ کو چھوڑ دینا بتاتا ہے کہ ان کی نیت اعتراض پیدا کرنا تھی نہ کہ احقاق حق۔

پیشتر اسکے کہ میں اصل معنی اس حدیث کے بیان کروں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ حُبّ کے معنے عشق کے نہیں ہوتے جیسا کہ مصنف ہفوات نے سمجھے ہیں۔ بلکہ یہ ایک وسیع معنوں کا لفظ ہے اور لغت میں اسکے یہ معنی لکھے ہیں۔ الحُبّ نقیض البغض والحب الوداد والمحبۃ یعنی حب کا لفظ بغض کے خلاف معنی رکھتا ہے اور اسکے معنے وداد اور محبت کے ہوتے ہیں۔ ان معنوں کو مدنظر رکھکر حُبّ کے معنے کسی کو پسند کرنے اسکو چاہنے اسکی خیر خواہی کرنے کے ہوتے ہیں یعنی عشق کے معنے نہیں بلکہ عام خیر خواہی اور پسندیدگی سے لیکر اعلیٰ سے اعلیٰ کشش اور اتصال کے معنی اس لفظ کے ہیں۔ چنانچہ ان معنوں میں یہ لفظ قرآن کریم اور احادیث اور لغت عرب میں کثرت سے مستعمل ہے۔ قرآن کریم میں خیر خواہی کے معنوں میں سورہ قصص میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے انک لا تھدی من احببت

ولکن اللہ یھدی من یشاء وھو اعلم بالمھتدین۔ قصص ع ۶۔ ترجمہ۔ تو ہر اس شخص کو ہدایت نہیں دے سکتا جسکی ہدایت کا تو خواہاں ہے لیکن اللہ جسے پسند کرتا ہے ہدایت دیتا ہے اور خدا ہی جانتا ہے کہ کون لوگ ہدایت کے مستحق ہیں۔ اس حدیث سے ثابت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کفار سے بھی محبت رکھتے تھے پس اگر مصنف ہفوات کے معنوں کے مطابق یوں سمجھا جائے کہ محبت کے معنے عشق کے اور ماسوا کو بھلا دینے کے ہوتے ہیں تو اس آیت کے نعوذ باللہ یہ معنے بنجائینگے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کفار کی محبت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ آپ معرفت الٰہی اور اجرائے احکام خدا میں زیادہ خوش نہ ہوتے تھے مگر ایسا خیال کفر ہے آپکا وجود تو اس آیت کا مصداق تھا۔ قل ان صلوٰتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العلمین۔ (انعام ع) پس اس آیت میں محبت کے معنی خیر خواہی کے ہیں اور مطلب یہ ہے کہ تو تو سب دنیا کا ہی خیر خواہ ہے اور چاہتا ہے کہ سب کو ہدایت ملجائے مگر تیری یہ خواہش پوری نہیں ہوسکتی کیونکہ اللہ تعالیٰ کی یہ سنت ہے کہ انہی لوگوں کیلئے ہدایت کے سامان جمع کرتا ہے جو خود ہدایت کے جویاں ہوتے ہیں اور ہدایت کا مقابلہ نہیں کرتے۔

کسی چیز کو نسبتی طور پر پسند کرنیکے معنوں میں بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے گو وہ اپنی ذات میں اچھی نہ ہو۔ چنانچہ حضرت یوسفؑ کی نسبت آتا ہے قال رب السجن احب الی مما یدعوننی الیہ (سورۂ یوسف ع) ترجمہ۔ یوسف علیہ السلام نے کہا اے میرے رب قید خانہ مجھے اس سے جسکی طرف یہ عورتیں مجھے بلاتی ہیں زیادہ پسند ہے۔ اسجگہ محبت کا لفظ ایک ایسی بات کی نسبت استعمال ہوا ہے جو اپنی ذات میں بری ہے لیکن نسبتی ترجیح کے سبب سے اس لفظ کو استعمال کیا گیا ہے۔

طبعی محبت اور عشق کے متعلق میں پہلے آیات لکھ آیا ہوں اسلئے اس جگہ اس کی تکرار کی ضرورت نہیں۔

احادیث میں بھی یہ لفظ کثرت سے ان معنوں میں استعمال ہوا ہے چنانچہ حُبّ کے معنوں کی تشریح میں لسان العرب نے دو حدیثیں لکھی ہیں جن سے حُبّ کے معنوں کی خوب تشریح ہوجاتی ہے۔ ایک حدیث تو یہ ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے احد پہاڑ کی نسبت فرمایا

ھو جبل یحبّنا ونحبّہ ۔ وہ ایک ایسا پہاڑ ہے جو ہم سے محبت کرتا ہے اور ہم اس سے محبت کرتے ہیں ۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ محبت کا لفظ نفع رسانی کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے پہاڑ محبت نہیں کیا کرتے ۔ پہاڑ کی محبت سے اس کا وہ نفع ہے جو وہ پہنچاتا ہے چونکہ احد کی جنگ میں ایک غلطی کے سبب سے مسلمانوں کو تکلیف اٹھانی پڑی اور لشکر اسلامی کا اجتماع اُحد پہاڑ پر ہی ہوا اور وہ دشمن کے حملوں سے بچانے کا ایک ذریعہ ہو گیا اسلئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ ہمیں نفع پہونچاتا ہے اور ہم اسکے قیام کو پسند کرتے ہیں ۔

اسی طرح لسان نے ایک دوسری حدیث انسؓ سے لکھی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا انظر واحبّ الانصارِ التمر یعنے انصار کی محبت کھجور سے دیکھو ۔ اسکے یہ معنی نہیں کہ انصار کھجور کے عشق میں سرشار تھے ۔ بلکہ اسکے یہ معنی ہیں کہ انصار کھجور کے مفید ہونے کو دیکھکر اسکی حفاظت کرتے تھے اور اسکے بونے اور جمع کرنے میں کوشاں رہتے تھے ۔

اسی طرح حدیث میں آتا ہے اذا ابتلیت عبدی بحبیبتیہ ثم صبر (بخاری کتاب المرضیٰ) یعنی جب بندہ کی آنکھیں ضائع ہو جائیں اور وہ صبر کرے ۔ آنکھوں کے لوگ عاشق نہیں ہوتے بلکہ اسکے یہ معنی ہیں کہ ان کے فائدہ کو دیکھکر انکی قدر کرتے ہیں اور انکی حفاظت کرتے ہیں اور انکو ضائع ہونے سے بچاتے ہیں ۔

غرض محبت کے معنے وسیع ہیں کسی چیز کو نفع رسان سمجھکر اس کی قدر کرنی اور اسکو تباہ ہونے سے بچانے کی کوشش کرنے اور نفع پہنچانے کے علاوہ طبعی کشش اور اتصال اور پھر کلی طور پر کسی کے خیال میں محو ہو جانے تک اس لفظ کا دائرہ وسیع ہے ۔

جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ محبت کے معنے صرف عشق کے نہیں ہیں جیسا کہ مصنف ہفوات نے اپنی ناواقفیت سے سمجھا ہے ، تو اب اس حدیث کے معنی سمجھنے میں کوئی دقت نہیں رہی ۔ اس حدیث میں النساء کا لفظ ہے اور النساء کے معنی عورتیں اور بیویاں دونوں ہو سکتے ہیں اور میرے نزدیک اسجگہ عورتوں کے معنے ہیں اور مطلب یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ بیان فرماتے ہیں کہ مجھے دنیا کی باتوں میں سے خصوصیت کے ساتھ عورتوں کی خیر خواہی اور خوشبو کی اشاعت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے ۔ مگر باوجود اسکے مجھے اصل لذت عبادت الٰہی میں

دیکھی ہے یعنے مخلوق کی اصلاح کی طرف بھی توجہ کرتا ہوں مگر جو لطف اللہ تعالیٰ کیطرف جھکنے میں آتا ہے اتنا لطف اس کام میں نہیں آتا کیونکہ یہ کام درحقیقت ضمنی ہے اصل کام اللہ تعالیٰ سے ملنا ہے ہاں خدا نے چونکہ اس کام کو بھی ضروری قرار دیا ہے اسلئے اسطرف بھی توجہ کرنی پڑتی ہے۔

اس حدیث کو مدنظر رکھو اور اس حالت کو دیکھو جو اسلام سے پہلے عورتوں اور طہارت کی تھی اور معلوم کرو کہ کیا یہ حدیث ایک اعلیٰ درجہ کی صداقت اور خوبی پر مشتمل ہے یا نہیں؟ کیا اس میں کچھ شک ہے کہ اسلام سے پہلے عورتوں کے حقوق کو پامال کیا جاتا تھا اور ان کے لئے ابدی حیات کا انکار کیا جاتا تھا اور ان کو مالوں اور جائدادوں کی طرح ایک منتقل ہونے والا ورثہ خیال کیا جاتا تھا اور ان کی پیدائش کو صرف مرد کی خوشی کا موجب قرار دیا جاتا تھا حتیٰ کہ مسیحی جو اپنے آپ کو حقوق نسواں کے حامی کہتے ہیں ان کے پاک نوشتوں میں بھی عورت کی نسبت لکھا تھا "البتہ مرد کو اپنا سر ڈھانکنا نہ چاہیئے کیونکہ وہ خدا کی صورت اور اس کا جلال ہے مگر عورت مرد کا جلال ہے" اقرنتیون باب ۱۱ آیت ۷۔ اسی طرح لکھا تھا "اور میں اجازت نہیں دیتا کہ عورت سکھائے" طمطاؤس باب ۲ آیت ۱۲۔ اسلام ہی ہے جس نے عورتوں کی انسانیت کو نمایاں کرکے دکھایا اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم ہی وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے عورتوں کے بلحاظ انسانیت برابر کے حقوق قائم کئے اور ولھن مثل الذی علیھن بالمعروف (بقرہ ع ۲۸) کی تفسیر لوگوں کے خوب اچھی طرح ذہن نشین کی۔ آپکے کلام میں عورتوں کے ساتھ حسن سلوک اور ان کے حقوق اور انکی قابلیتوں کے متعلق جسقدر ارشادات ہیں انکا دسواں حصہ بھی کسی مذہبی پیشوا کی تعلیم میں نہیں ملتا اور یہی مطلب ہے حبب الی النساء کا یعنی عورتوں کی قدردانی اور انکی خوبیوں کا احساس میرے دل میں پیدا کیا گیا ہے۔

وہی سلوک جو عورتوں سے آنحضرت کی بعثت سے پہلے کیا گیا تھا کم وبیش طور پر خوشبو سے بھی کیا گیا تھا۔ عیسائیوں میں اور ہندوؤں کے بعض فرقوں میں بزرگان دین کیلئے پاک رہنا اور خوشبو کا استعمال بالکل حرام سمجھا جاتا تھا گندے اور بدبودار لباس کا استعمال اور ناخن نہ کٹوانا اور میل نہ اتارنا بہت بزرگی خیال کی جاتی تھی اور مختلف اقوام میں بھی

خوشبو کے استعمال کو روحانیت کیلئے مضر سمجھا جاتا تھا حالانکہ جیسا کہ طب سے ثابت ہوا ہے خوشبو صحت کی بہتری اور خیالات کے بلند کرنے میں ممد ہوتی ہے اور بدبو اس شخص کیلئے بھی مضر ہوتی ہے جو گندہ رہتا ہے اور دوسروں کو بھی اس سے ضرر ہوتا ہے جیسا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا من اکل من ھذہ الشجرۃ یعنی الثوم فلا یأتین المساجد فان الملائکۃ تاذی مما یتاذی منہ الانس۔ یعنے جو شخص اس بودار پودے لہسن کا استعمال کرے اسے چاہیئے کہ مسجدوں میں نہ آئے کیونکہ ملائکہ بھی ان چیزوں سے تکلیف محسوس کرتے ہیں جن سے انسان تکلیف محسوس کرتے ہیں۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے بو کو لوگوں کے لئے مضر قرار دیا ہے اور یہی وجہ تھی کہ آپ نے جمعہ کے دن بوجہ اجتماع کے خوشبو کے استعمال کا حکم دیا۔

غرض کہ رسول کریم کی خصوصیات میں سے ایک یہ بات تھی کہ آپ نے جگہ کی پاکیزگی کے علاوہ جو مختلف مذاہب میں ضروری سمجھی جاتی تھی شخصی صفائی کو بھی ضروری قرار دیا اور اسی مضمون کی طرف اس حدیث میں اشارہ کیا گیا ہے۔

لیکن چونکہ بعض لوگ افراط کا پہلو اختیار کر لیتے ہیں اسلئے فرمایا وجعلت قرۃ عینی فی الصلوٰۃ یعنے میری اصل راحت نماز میں ہی رکھی گئی ہے پس چاہیئے کہ میرے ان احکام کو دیکھکر کہ عورتوں سے نیک سلوک ہونا چاہیئے اور خوشبو کا استعمال کرنا چاہیئے کوئی شخص یہ غلط مفہوم نہ لیلے کہ بس عورتوں کی رضا ہی میں لگا رہے اور ظاہری صفائی میں ہی لگا رہے بلکہ چاہیئے کہ عورتوں سے حسن سلوک بھی کرو اور ظاہری پاکیزگی کا بھی خیال رکھو لیکن اصل لذت تمکو اللہ تعالےٰ ہی کی یاد میں حاصل ہو۔

مصنف صاحب ہفوات ان معنوں پر غور کریں اور سوچیں کہ کیا یہ حدیث اسکا کہ درافق کے قابل ہے یا اس قابل ہے کہ اسکو دشمنوں کے سامنے اسلام کی خوبیوں کے اظہار اور رسول کریم کے کمالات کیلئے پیش کیا جائے ان کو چاہیئے کہ جب وہ کسی حدیث کے معنی کرنے لگیں تو یہ دیکھ لیا کریں کہ وہ انکی نسبت نہیں ہے بلکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی نسبت ہے اور اسکے اندر ان کے خیالات کا اظہار نہیں ہے بلکہ رسول کریم صلعم کے خیالات کا اظہار ہے اور اپنے خیالات اور جذبات کے مطابق اس کا ترجمہ نہ کیا کریں۔

اگر اس حدیث میں نساء کا جو لفظ استعمال ہوا ہے اسکے معنے بیویاں کیا جائے تب اس
حدیث کے یہ معنی ہونگے کہ اللہ تعالے نے بیویوں اور خوشبو کیطرف میری رغبت جبراً کی ہے
ورنہ میری لذت تو نماز ہی میں ہے اور یہ معنی بھی صحیح ہیں۔ اگر اسلام میں رہبانیت کو روکا نہ جاتا
اور اسکی اجازت دیجاتی تو اغلب تھا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم امور خانہ داری میں پڑنے
کی بجائے اپنے اوقات کو ذکر الہی ہی میں صرف کرتے۔ مگر چونکہ اللہ تعالے نے اس کام کو ذکر الہی
کا جزو قرار دیا ہے اور خصوصاً رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کیلئے تو بہت سی بیویوں کا ہونا ضروری
تھا تاکہ وہ عملاً رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے طریق معاشرت کو سیکھیں اور دوسروں کو
سکھائیں۔ یہی وجہ ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے حُبِّبَ بصیغہ مجہول فرمایا ہے۔
أحبُّ بصیغہ معروف نہیں فرمایا ہیں۔ حدیث کے یہ معنے ہوئے کہ اللہ تعالے کے حکم اور اسکی حکمت
کاملہ کے ماتحت مینے بہت سے نکاح کئے ہیں اور خوشبو کو پسند کرتا ہوں ورنہ میری لذت تو ذکر الہی
میں تھی۔ یا دوسرے لفظوں میں یہ کہ دنیا کی کوئی لذت رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم بخواہش خود
استعمال نہیں فرماتے تھے بلکہ اللہ تعالی کے منشاء اور اسکے ازلی قانون کی متابعت میں بقدر ضرورت
دنیا کی چیزوں سے تعلق رکھتے تھے اور یہ مضمون آیت ان صلوتی ونسکی ومحیای ومماتی
للہ رب العلمین کے عین مطابق ہے اور اسپر اعتراض کرنا کورچشمی کی دلیل ہے۔

مینے اس اعتراض پر زیادہ بسط سے اسلئے لکھا ہے کہ یہ ایک اصولی سوال ہے اور مصنف
ہفوات کی طرح بہت سے لوگ اس وہم میں پڑے ہوئے ہیں کہ استعمال طیبات شائد ایک مکروہ
بات ہے جو عام مومنوں کو تو جائز ہو سکتی ہے مگر بزرگوں اور نبیوں کے لئے جائز نہیں حالانکہ
معاملہ بالکل برعکس ہے۔ طیبات ایک نعمت ہے اور ہر نعمت کا اصل مستحق اللہ تعالے کے
محبوب بندے ہیں اگر ان کا وجود نہوتا تو یہ دنیا ہی پیدا نہ کی جاتی۔ ہاں چونکہ وہ اپنی محبت کو خدا
ہی کیلئے وقف کر چکے ہوتے ہیں وہ جس دنیاوی کام کو کرتے ہیں محض احکام الہی کی بجا آوری
میں کرتے ہیں اور اسکے قانون کے ادب کو مدنظر رکھکر کرتے ہیں اور وہ لوگ جو ان نعمتوں کے
حقیقی مستحق نہیں ہیں وہ زیادہ شوق انہی کا رکھتے ہیں جیسے ایک شخص کسی دوست کو ملنے
جاتا ہے تو جبکہ مہمان کی تمام توجہ اپنے دوست کی صحبت سے فائدہ اٹھانے میں لگی ہوئی ہوتی ہے

اور وہ کھانا محض دوست کے اظہار محبت کی قدر کے طور پر کھاتا ہے اسکے نوکروں کی توجہ زیادہ کھانے کیطرف ہوتی ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ جو کچھ میں نے لکھا ہے وہ ایک حق پسند انسان کی تسلی کیلئے کافی ہے لیکن سب دنیا حق پسند نہیں ہوتی اور خصوصاً مصنف ہفوات کے تو ایک ایک لفظ سے تعصب اور بغض ٹپک رہا ہے۔ انکی نسبت یہ خیال بہت مشکل ہے کہ وہ بلا اپنے گھر کے بھید معلوم کرنیکے خاموش ہوں بلکہ کوئی تعجب نہیں کہ وہ سب جواب پڑھکر پھر بھی تحریر فرمادیں کہ "مسلمانوں کو کسی کنہیا پرستنے یہ عبارت دی اور انہوں نے اس نقل کو حدیث سمجھ لیا"۔ پس چاہتا ہوں کہ ان کو بتادوں کہ وہ کنہیا پرست (نعوذ باللہ من ذٰلک) کا لفظ کسکی نسبت استعمال کررہے ہیں۔ فروع کافی جلد ۲ کتاب النکاح باب النساء میں عمر بن یزید امام ابو عبد اللہ رض سے روایت کرتے ہیں۔ قال ما اظن رجلاً یزداد فی الایمان الا ازداد حبا للنساء۔ ترجمہ۔ میں ہرگز خیال نہیں کرسکتا کہ کوئی شخص ایمان میں ترقی کرتا ہو بلا اسکے کہ ساتھ عورتوں کی محبت میں بھی بڑھتا ہو۔ دوسری روایت حفص بن البختری کی امام ابو عبد اللہ رض سے اسی کتاب اور اسی باب میں درج ہے اور وہ یہ ہے قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ما احببت من دنیاکم الا النساء والطیب۔ ترجمہ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں میں تمہاری دنیا میں سے محبت نہیں کرتا مگر عورتوں اور خوشبو سے۔ یہ الفاظ ابوداؤد کی روایت سے بہت زیادہ سخت ہیں کیونکہ انمیں تو حُبّبَ کے لفظ تھے جن کا یہ مطلب ہوسکتا ہے کہ میں خود تو محبت نہیں کرتا مجھ سے محبت کرائی جاتی ہے۔ لیکن امام ابو عبد اللہ رض ایک طرف تو یہ فرماتے ہیں کہ کوئی شخص ایمان میں ترقی ہی نہیں کرسکتا جبتک اسے عورتوں سے محبت نہ ہو۔ دوسری طرف رسول کریم صلعم کیطرف یہ منسوب کرتے ہیں کہ آپ فرماتے ہیں میں تمہاری دنیا میں سے عورتوں اور خوشبو سے محبت کرتا ہوں اب مصنف ہفوات صاحب فرمائیں کہ وہ کنہیا پرست اور واضع حدیث کے الفاظ اس امام اہل بیت کی نسبت بھی استعمال کرینگے یا صرف یہ الفاظ ابوداؤد ہی کی نسبت استعمال کئے جاسکتے ہیں؟ ان کو یاد رکھنا چاہئے کہ جب کوئی شخص کسی راستباز انسان پر اعتراض کرتا ہے تو اس کا قدم ٹھہر ہی نہیں سکتا جبتک سب راستبازوں پر حملہ نہ کرے کیونکہ راستباز سب ایک زنجیر سے

بندھے ہوئے ہیں اور سب کا تعلق اللہ تعالےٰ سے ہے جو ان ہیں سے کسی ایک کے رستہ میں پتھر رکھتا ہے وہ سب کو گرانے کی کوشش کرتا ہے۔ جو ایک کو دھکا دیتا ہے وہ سب کو دھکا دیتا ہے۔ یا تو انسان سب راستبازوں کو قبول کرلے یا اسے سب کو رد کرنا پڑیگا۔ اور اس کا دعوائے ایمان اسکے کسی کام نہ آئیگا کیونکہ اسکے اقوال اسکے ایمان کو رد کر رہے ہیں ؛

اس سے بھی بڑھکر وہ روایت ہے جو علی بن موسیٰ رضا رضہ سے معمر بن خلاد نے بیان کی ہے اور وہ یہ ہے۔ یقول ثلث من سنن المرسلین العطر واخذ الشعر وکثرۃ الطروقۃ[1] یعنے تین چیزیں نبیوں کی سنتوں میں سے ہیں۔ اول خوشبو۔ دوم بال صاف کرنا۔ سوم کثرت جماع۔ فروع کافی جلد دوم کتاب النکاح باب حب النساء۔ اب مصنف ہفوات بتائیں کہ علی بن موسی الرضا تو عورتوں کی صحبت کی کثرت کو سنت انبیاء قرار دیتے ہیں۔ پھر آپ اسے کنہیا پرستی قرار دیکر کس کو گالیاں دے رہے ہیں ؟ آیا ائمہ اہل سنت کو یا خود ائمہ اہلبیت کو ؟

مندرجہ بالا احادیث جو اہل شیعہ کی روایات ہیں سے ہیں مصنف ہفوات کی آنکھیں کھولنے کیلئے کافی ہونگی۔ مگر میں دو اور روایتیں لکھکر جو ان سب سے بڑھکر ہیں ان کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ ان کو بھی دوسروں کے گھر میں بیٹھکر آگ سے نہیں کھیلنا چاہئے۔ ایک شیعہ صاحب امام ابو عبد اللہ رضہ سے روایت کرتے ہیں کہ مینے حضرت امام ابو عبد اللہ رضہ سے پوچھا کہ سب سے زیادہ لذیذ شئے کیا ہے ؟ تو آپنے جوابدیا الذ الاشیاء مباضعۃ النساء۔ سب سے زیادہ لذیذ چیز عورت سے جماع کرنا ہے وہ لفظ جو امام ابو عبد اللہ رضہ کی طرف اس شیعہ مخلص نے منسوب کیئے ہیں بہت زیادہ ننگے اور واضح ہیں لیکن مینے انکا ترجمہ سنجیدہ الفاظ میں کر دیا ہے۔ امید ہے کہ مصنف صاحب ہفوات لغت دیکھکر خود معلوم کرلینگے کہ ان لفظوں کا لفظی ترجمہ ہماری زبان میں کیا ہو سکتا ہے۔ اور پھر اس طرز تحریر کو بدلنے کی کوشش کرینگے جو الفاظ احادیث کی وجہ سے نہیں بلکہ بخاری کے مترجم کے بعض نامناسب الفاظ سے فائدہ اُٹھا کر انہوں نے اپنی کتاب میں اختیار کی ہے ؛

---

[1] مصنف صاحب ہفوات نے دوسرے ایڈیشن میں کچھ تبدیلیاں کر دی ہیں چنانچہ عورتوں اور خوشبو کی محبت کے متعلق چونکہ ان کو اپنے بزرگوں سے معلوم ہوا ہے کہ ان کا ذکر تو سنیوں سے بڑھکر ہماری کتب میں موجود ہے اسلیئے انہوں نے دوسرے ایڈیشن میں اعتراض کا پہلو یوں بدل دیا ہے کہ ان چیزوں سے محبت تو ہر صحیح القویٰ کو ہوتی ہے رسول کی کیا خصوصیت ہے ؟ لیکن یہ اعتراض بھی ویسا ہی بودہ ہے کیونکہ حدیث میں خصوصیت کا ذکر ہی نہیں بلکہ اظہار واقعہ ہے مگر سوال یہ ہے کہ یہی احادیث کتب شیعہ میں بھی موجود ہیں وہ کس خصوصیت کی وجہ سے

دوسری روایت اہل شیعہ کی جو میں پیش کرنا چاہتا ہوں حسب ذیل ہے۔ عقبہ بن خالد بیان کرتے ہیں میں ابو عبداللہ علیہ السلام کے پاس آیا جب آپ گھر سے نکل کر آئے تو کہا کہ یاعقبۃ شغلنا عنك هؤلاء النساء۔ ترجمہ۔ اے عقبہ ان عورتوں نے ہمیں مشغول رکھا اور تیرے پاس نہ آنے دیا۔ فروع کافی جلد دوم کتاب النکاح باب غلبۃ النساء۔ مذکورہ بالا دونوں روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک تو امام صاحب جو نبیوں کی طرح آپکے عقیدے میں معصوم تھے عورتوں سے تعلق کو سب سے زیادہ لذیذ شئے بتاتے ہیں۔ دوسرے دین کی خدمت پر آنیوالے لوگوں سے عورتیں ان کو روک بھی لیتی ہیں اور وہ ان کی صحبت میں بیٹھے ہوئے خدمت دین کو بھول جاتے ہیں۔ کیا اب اہل سنت بھی کہہ دیں کہ " امام کی شان تو یہ ہے کہ وہ معرفت الٰہی اور ہدایت خلق اللہ اور اجرائے احکام خدا میں زیادہ خوش ہو نہ کہ عورتوں اور اسکے لوازم خوشبو سے معاذ اللہ" اور کیا مصنف صاحب ہفوات اپنے اخوان شیعہ صاحبان کی مدد سے ان کتب اہل شیعہ کے احکاک اور احراق کا کوئی انتظام کرینگے؟ میرے نزدیک ان کو پہلے اپنے گھر کی کتب کے احراق اور احکاک سے فارغ ہو لینا چاہئیے پھر دوسری طرف توجہ کرنی چاہئیے کیونکہ دوسرے کو کہنے کا وہی شخص مستحق ہوتا ہے جو پہلے اپنے گھر کا انتظام کر لے۔

یہ جواب تو اس اصل کو مدنظر رکھتے ہوئے ہے جو مصنف ہفوات نے تجویز کیا ہے لیکن ہم جس اصل کو صحیح تسلیم کرتے ہیں اسکے رو سے امام ابو عبداللہ رضؓ کی طہارت اور پاکیزگی اور تقویٰ اور بزرگی میں کچھ بھی فرق نہیں آتا۔ نہ ان کتب اہل شیعہ کی تحقیر ہوتی ہے۔ ہم جب تک بددیانتی ثابت نہ ہو ان کی کوشش کی بھی قدر کرتے ہیں اور میرے نزدیک انہوں نے ائمہ اہل بیت کے اقوال نقل کرکے ایک قابل قدر خدمت کی ہے۔ اگر اس خدمت میں نادانستہ ان سے کوئی غلطی ہوئی ہے تو اس سے انکی شان میں کوئی فرق نہیں آتا۔ نہ انکی کتابوں کی عظمت کو صدمہ پہنچتا ہے اور اگر دانستہ غلطی کی ہے تو اسکے ذمہ وار وہ خدا تعالیٰ کے حضور میں ہونگے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت عائشہؓ سے عشق

دوسرا اعتراض مصنف ہفوات کا یہ ہے کہ احادیث میں لکھا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ

علیہ وسلم حضرت عائشہ رضہ کے عاشق تھے۔ اور یہ بات غلط ہے۔ اور اسکی تائید میں انہوں نے کئی احادیث نقل کی ہیں جنکے متعلق میں الگ لکھتا ہوں، اول تو انہوں نے جواب الکافی سے ایک حدیث نقل کی ہے کہ ام سلمہ رضہ نے کہا کان اذرأی عائشتہ لم یتمالک نفسہ۔ جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ رضہ کو دیکھتے تھے تو ان کا اپنے نفس پر قابو نہیں رہتا تھا۔ یہ روایت جواب الکافی میں بلا حوالہ کتاب اور بلا سند درج ہے اسلئے نہیں کہہ سکتا کہ یہ کسی کتاب میں سے مصنف کتاب نے درج کی ہے یا یہ کہ ان بے شمار ناقابل اعتبار روایات میں سے ایک ہے، جو عام طور پر مجالس وعظ کی زینت کیلئے لوگوں میں مشہور تھیں۔ مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ اس حدیث کا مضمون قابل اعتراض ہے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کے خلاف اور قرآن کریم کے بتائے ہوئے اخلاق محمدی کے برعکس ہے پس یہ روایت بسبب مضمون قرآن اور صحیح روایات اور عقل سلیم کے خلاف ہونیکے غلط ہے اور الیٰ آیات سے معلوم ہوتی ہے جو عبد اللہ بن ابی بن سلول کے چیلے چانٹوں کی طرف سے مشہور کیجاتی تھیں اور جن کا ذکر بعد میں منافق مسیحی اور یہودی نومسلموں نے تازہ رکھا۔ مگر باوجود اسکے کہ یہ روایت میرے نزدیک بالکل ناقابل اعتبار اور صریح دروغ ہے اسکے پیش کرنیسے مصنف ہفوات کا جو منشاء ہے وہ کسی صورت میں پورا نہیں ہوسکتا نہ اس روایت کا جھوٹا ہونا جیسا کہ میں پہلے ثابت کر آیا ہوں محدثین کی شان کو کم سکتا ہے۔ اور نہ ضرورت حدیث کو باطل کر سکتا ہے اور نہ اسکے جھوٹے ہونے سے ہمارے لئے یہ جائز ہو سکتا ہے کہ اس روایت کو کتابوں میں سے نکال پھینکیں۔ اگر ہم ایسا کرنے لگیں تو بعض دوسرے لوگ اسکے مقابلہ میں صداقتوں کو بھی نکال کر پھینکدینگے۔

میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ احادیث کی کتب غلطی سے پاک نہیں ہیں اور نہ ہر ایک کتاب نیک نیتی سے لکھی گئی ہے کئی کتب بعض مجالس وعظ کو رونق دینے کیلئے لکھی گئی ہیں مگر باوجود اسکے اس فن کے کمال تک پہنچانے والوں کی خدمت اسلام کا انکار نہیں ہوسکتا اور ہزاروں حدیثوں کے جھوٹا نکلنے پر بھی اس فن کی حقارت نہیں کیجاسکتی۔ اس وقت کوئی شخص قابل ملامت ہو سکتا ہے جبکہ وہ ان مزیل شان رسالت احادیث کو صحیح قرار دے اور انکی اپنی تائید میں

بھی نہ کرے جس سے وہ اعتراض دور ہو جائے جو ان سے پیدا ہوتا ہے۔

مگر ہم دیکھتے ہیں کہ علماء سلف ایسی روایات کو ہمیشہ باطل قرار دیتے چلے آئے ہیں پس صرف نقل کر دینے کے سبب وہ کسی الزام کے نیچے نہیں آسکتے کیونکہ انکا خیال تھا کہ ہمیں ہر ایک قسم کی روایات لوگوں کیلئے جمع کر دینا چاہئے۔ ہاں علماء خلف بیشک اس الزام کے نیچے ہیں کہ انہوں نے ان احادیث اور روایات کو اتنا رواج نہیں دیا جنسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقی شان ظاہر ہوتی تھی اور اپنے وعظوں کو عوام میں دلچسپ بنانے کیلئے جھوٹے قصوں اور غلط روایات کو صحیح احادیث قرار دیکر لوگوں میں خوب رائج کیا بلکہ انکا انکار کرنیوالوں کو اسلام کا دشمن اور حدیث کا دشمن قرار دیا۔ ایسے لوگوں کے طریق عمل کو ہم اس سے بھی زیادہ حقارت کی نگہ سے دیکھتے ہیں جتنا کہ مصنف صاحب ہفوات کے طریق عمل کو دیکھتے ہیں کیونکہ مصنف صاحب ہفوات نے تو ازواج مطہرات اور صحابۂ کرام اور علماء اسلام پر حملہ کیا ہے اور ان لوگوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بدنام کرنیکی کوشش کی ہے اور عبداللہ بن ابی سلول کے ہم آواز ہو گئے ہیں۔ ہماری جماعت کی کوششیں شروع سے ایسے ناپاک لوگوں کے خلاف صرف ہوتی رہی ہیں اور ہوتی رہینگی جبتک کہ یہ لوگ اہل اکاذیب ہوتے ہوئے حدیث کے نام کو بدنام کرنا اور قرآن کریم پر روایات کو جو محتمل کذب و صدق ہیں، مقدم کرنا نہ چھوڑ دینگے۔

دوسری روایت اس خیال کی تصدیق میں مصنف ہفوات نے بخاری کتاب التفسیر سے پیش کی ہے۔ یہ روایت ابن عباس رضؓ سے مروی ہے اور اس کا خلاصہ یہ ہو کہ ابن عباس رضؓ کہتے ہیں کہ میرے دل میں مدت سے خواہش تھی کہ میں حضرت عمر رضؓ سے ایک بات دریافت کروں آخر ایک دن موقعہ پاکر میں نے آپسے پوچھا کہ وہ دو عورتیں جنہوں نے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے خلاف آپس میں ایک دوسرے کی مدد کی تھی وہ کون ہیں؟ تو آپ نے فرمایا وہ حفصہؓ اور عائشہ رضؓ ہیں اور پھر فرمایا کہ ہم لوگوں میں عورتیں بالکل حقیر سمجھی جاتی تھیں حتیٰ کہ قرآن کریم میں انکے حقوق مقرر ہوئے۔ ایکدن کسی بات کو میں سوچ رہا تھا میری بیوی نے مجھے کہا کہ اگر اس طرح کر لو تو اچھا ہے میں ناراض ہوا کہ تو نے کیا حق کیا ہے کہ مجھے مشورہ دے اسپر میری بیوی نے کہا عجبالک یا ابن الخطاب ما ترید ان تراجع انت وابنتک

لتراجع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حتیٰ یظل یومہ غضبان فقام عمر فاخذ ردائہ مکانہ حتیٰ دخل علیٰ حفصۃ فقال لہا یا بُنَیَّۃُ انک لتراجعین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حتیٰ یظل یومہ غضبان فقالت حفصہ واللہ انا لنراجعہ فقلت تعلمین انی احذرک عقوبۃ اللہ وغضب رسول اللہ صلعم یا بنیۃ لا تغرنک ھٰذہ التی اعجبہا حسنہا حب رسول اللہ ایاھا یرید عائشۃ

(ترجمہ) اے ابن خطاب. تجھے تعجب ہے کہ تو نا پسند کرتا ہے کہ تیری بیوی تیری بات میں بولے اور تیری بیٹی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں کا جواب دیتی ہے یہاں تک کہ آپ کبھی سارا سارا دن ناراض رہتے ہیں۔ یہ سُنکر عمرؓ کھڑے ہوئے اور اپنی چادر ٹھیک طرح اوڑھی اور حفصہؓ کے پاس آئے اور کہا کہ اے بیٹی کیا یہ سچ ہے کہ تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی باتوں میں بول پڑتی ہے۔ یہاں تک کہ آپ دن دن بھر ناراض رہتے ہیں۔ حفصہؓ نے کہا خدا کی قسم ہم تو آپ کی باتوں کا جواب دیدیا کرتی ہیں۔ پس مینے کہا یاد رکھ میں تجھے اللہ کے عذاب اور اس کے رسول کے غضب سے ڈراتا ہوں۔ اے بیٹی تجھے اس بیوی کا طریق عمل دھوکے میں نہ ڈالے جسے اپنے حسن یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت پر ناز ہے اور اس سے ان کی مراد حضرت عائشہؓ سے تھی۔

اس ٹکڑہ حدیث کو نقل کرکے مصنف ہفوات یہ اعتراض کرتے ہیں۔ اوّل رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ شان کہ جس بی بی کا دل خدا سے پھر گیا ہو اسپر آپ فریفتہ ہوں دوم جو بیوی خدا سے منحرف ہو وہ ان کی زوجیت میں رہ جائے۔ ایسا نہیں ہوسکتا۔ سوم رسول اللہ پر ازواج کی یہ زیادتیاں ہوں کہ آپ کئی کئی دن غم و غصّہ میں مبتلا رہیں یعنے کار رسالت سے معطل رہیں۔ ان ہفوات کو عقل انسانی ہرگز قبول نہیں کرتی ہے۔

چونکہ عشق کے ہیڈنگ کے نیچے یہ حدیث لکھی گئی ہے۔ اور چونکہ اعتراضات میں عشق کا ذکر نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف ہفوات کے نزدیک عشق کے

اعتراض کے علاوہ مذکورہ بالا حدیث پر یہ اعتراض پڑتے ہیں:
اس حدیث سے عشق کا مفہوم نکالنا تو مصنف ہفوات کی عقل میں ہی آسکتا ہے کیونکہ اس میں نہ عشق کا کوئی ذکر ہے نہ کوئی واقعہ ایسا لکھا ہے جس میں یہ اشارہ پایا جائے کہ رسول کریم صلے اللہ کو حضرت عائشہ رض سے عشق تھا۔ ہاں یہ اشارہ پایا جاتا ہے کہ حضرت عائشہ رض سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت حفصہ رض کی نسبت زیادہ محبت تھی۔ لیکن یہ کوئی ایسی بات نہیں جس سے عشق کا نتیجہ نکالا جائے یا جس پر کسی قسم کا اعتراض ہو سکے۔ حضرت عائشہ رض کی نیکی۔ ان کی رسول کریم صلعم سے فدائیت اور ان کے والد رض کی خدمات و قربانیاں ایسی نہ تھیں کہ ان کی وقعت کو دوسری بیویوں کی نسبت رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی نظر میں بڑھا نہ دیتیں۔ پس اس کی وجہ سے حضرت عائشہ رض سے آنحضرت صلعم کا زیادہ محبت کرنا قابل اعتراض امر نہیں بلکہ اس قدر دانہ طرز عمل پر روشنی ڈالتا ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت ایک ممتاز نمونہ پیش کرتی ہے۔ اور اس اعتراض سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ مصنف صاحب ہفوات کی نظر میں محبت کا کوئی نہایت ہی غلط مفہوم بیٹھا ہوا ہے اور وہ اپنی جہالت کا غصہ ائمہ حدیث پر نکالنا چاہتے ہیں۔

دوسرا اعتراض بھی کہ جس بی بی کا دل خدا تعالیٰ سے پھر گیا ہو اس پر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کس طرح فریفتہ ہو سکتے تھے۔ ایسا ہی غلط ہے جیسا کہ پہلا۔ کیونکہ قرآن کریم میں ہرگز کسی جگہ یہ بیان نہیں ہوا کہ حضرت عائشہ رض یا کسی اور بیوی کا دل پھر گیا تھا۔ بلکہ قرآن کریم میں تو اس کی بجائے یہ بیان ہے کہ ان کا دل اللہ تعالےٰ کی طرف مائل تھا۔ اور وہ اس کی رضا پر چلنے کے لئے بالکل تیار تھیں۔ مصنف ہفوات خود ہی آیت کے ایک غلط معنے کر کے ائمہ حدیث پر اعتراض کرنے لگیں تو اس میں ائمہ حدیث کا کیا قصور ہے؟۔

وہ الفاظ قرآن جن سے مصنف ہفوات نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ حضرت عائشہ رض کا دل خدا تعالےٰ سے پھر گیا تھا یہ ہیں۔ ان تتوبا الی اللہ فقد صغت قلوبکما

وان تظاھرا علیه فان اللہ ھو مولٰه وجبریل وصالح المؤمنین والملائکة بعد ذالک ظهیر۔ تحریم ع ۱- (ترجمہ) اگر تم اللہ تعالےٰ کی طرف رجوع کرو۔ تو تمہارے دل تو جھک ہی چکے ہیں اور اگر تم دونوں اسکے خلاف ایک دوسرے کی مدد کرو تو اللہ اس کا دوست ہے اور جبریل بھی اور مسلمانوں میں سے نیک لوگ بھی اور پھر اسکے ساتھ فرشتے بھی اسکے مددگار ہیں۔ اس آیت سے ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعض بیویوں کے دل خدا سے پھر گئے تھے بلکہ اسکے برخلاف یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان بیویوں کے دل اللہ تعالیٰ کی طرف جھکے ہوئے تھے۔ کیونکہ ان تتوبا الی اللہ کے بعد فقد صغت قلوبکما فرمایا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پچھلا فعل پہلے فعل کا باعث اور موجب ہے۔ اور یہ خیال کرنا کہ کسی شخص کا دل پھر جانا توبہ کا موجب اور باعث ہوگا عقل کے خلاف ہے۔ دل میں خشیت کا پیدا ہونا توبہ کا محرک ہوتا ہے نہ کہ دل کا خدا سے دور ہو جانا۔ پس فقد صغت قلوبکما کے یہ معنی نہیں ہیں کہ تمہارے دل اللہ تعالےٰ سے پھر گئے ہیں۔ بلکہ یہ معنے ہیں کہ تمہارے دل تو پہلے ہی اللہ تعالیٰ کی طرف جھکے ہوئے ہیں یعنی یہی کام تمہارا اصلی کام ہے اور غلطی دل سے نہیں ہوئی بلکہ سہواً ہوئی ہے۔ ان معنوں کے سوا دوسرے کوئی معنے کرنے لغت عرب اور قواعد زبان کے بالکل خلاف ہیں اور ہرگز جائز نہیں اور تعجب ہے ان لوگوں پر جو تعریفی کلمات کو مذمت قرار دیتے ہیں۔

غرض اس آیت میں تو تعریف کی گئی ہے کہ اگر اے بیویو تم توبہ کرو تو تم اسکی اہل ہو۔ کیونکہ تمہارے دل پہلے ہی خدا کی طرف جھکے ہوئے ہیں۔ ہاں اگر توبہ نہ کرو تو ہمیں تمہاری پرواہ نہیں۔ اگر اس آیت کے وہ معنے لئے جاویں جنہیں مصنف صاحب ہفوات نے پسند کیا ہے۔ تو یوں معنے ہوئے۔ اگر تم توبہ کرو تو تمہارے دل تو خدا سے دور ہو ہی چکے ہیں۔ اور اگر تم رسول کے خلاف کام کرو تو خدا اور مومن اور فرشتے اسکے مددگار ہیں۔ کیا کوئی عقلمند اس فقرہ کی بناوٹ کو درست کہہ سکتا ہے؟ کیونکہ مقابلہ کے فقروں میں دونوں حصوں کا مقابلہ ہوتا ہے۔ لیکن ان معنوں کے

رو سے پہلے فقرہ کے دوسرے حصہ کا مقابلہ کسی جملہ سے نہیں رہتا اور مزید براں یہ عجیب مہمل بات بنجاتی ہے کہ اگر تم توبہ کرو تو تم تو پہلے ہی گنہ کی طرف مائل ہو چکی ہو کیا گنہ کی طرف میلان کے باعث توبہ نصیب ہوتی ہے یا خدا تعالیٰ کی طرف توجہ کرنے سے اور اس سے تعلق پیدا کرنے سے۔ پس صحیح معنے وہی ہیں جو میں اوپر بیان کر چکا ہوں۔ اور ان کے رو سے آیت مذکورہ بالا سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ بعض بیویاں رسول کریم کی اللہ سے دور ہو گئی تھیں۔ بلکہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپکی وہ بیویاں دل سے نیک اور پرہیزگار تھیں۔ جو غلطی ان سے ہوئی تھی وہ سہوًا اور بشریت کی کمزوری کے ماتحت تھی ؛

دوسرا اعتراض مصنف صاحب ہفوات کا یہ ہے کہ جو بیویاں خدا سے منحرف ہوں وہ نبی کی زوجیت میں کس طرح رہ سکتی ہیں؟ یہ اعتراض تین وجہ سے باطل ہے

اول تو اس وجہ سے کہ حضرت نوح اور حضرت لوط کی بیویاں خدا سے دور تھیں مگر باوجود اسکے وہ ان کی زوجیت میں رہیں۔ اگر مصنف صاحب ہفوات اس صورت کا آخری حصہ پڑھ لیتے تو ان کو یہ ٹھوکر نہ لگتی مگر قرآن کا پڑھنا تو ان کے لئے نہایت مشکل ہے کیونکہ ان کے نزدیک حضرت عثمان رضنے اس میں بہت کچھ رخنہ اندازی کردی ہوئی ہے (نعوذ باللہ من ذلک) ان کے نزدیک تو قرآن کریم کی صرف وہی آیت قابل سند اور قابل مطالعہ ہے۔ جس میں سے وہ توڑ مروڑ کر کوئی اعتراض خدام اسلام پر کرسکیں ؛

اسی سورۃ کے آخر میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وضرب اللہ مثلا للذین کفروا امرأۃ نوح وامرأۃ لوط کانتا تحت عبدین من عبادنا صالحین فخانتاھما فلم یغنیا عنھما من اللہ شیئًا وقیل ادخلا النار مع الداخلین۔ سورۂ تحریم ع ۲ (ترجمہ) اور اللہ تعالیٰ کافروں کی دو مثالیں بیان کرتا ہے۔ ایک تو نوح کی بیوی کی اور ایک لوط کی بیوی کی۔ وہ دونوں ہمارے نیک بندوں کے نکاح میں تھیں مگر ان کے خلاف رستہ پر چلیں پس وہ دونوں نبی خدا کے عذاب سے ان کو ذرہ بھی نہ بچا سکے۔ اور ان دونوں سے کہا گیا

کہ جس طرح باقی لوگ آگ میں داخل ہوتے ہیں تم بھی آگ میں داخل ہو جاؤ۔ یہ آیت بتاتی ہے کہ باوجود خدا سے دور ہونے کے ایک عورت نبی کے نکاح میں رہ سکتی ہے کیونکہ مذہب اور عقیدہ کا تعلق نکاح کے ساتھ نہیں۔ (ہاں اہل اسلام کے لئے شرط ہے کہ صرف اہل کتاب سے شادی کریں) ظاہری اخلاق اور شرافت کا تعلق ہے۔ ایک بدکار اور فاحشہ عورت نبی کی بیوی نہیں رہ سکتی۔ لیکن مذہباً اگر وہ خراب ہے تو وہ نکاح میں رہ سکتی ہے۔

دوسرا جواب اس کا یہ ہے کہ جیسا کہ میں پہلے ثابت کر چکا ہوں۔ اس آیت کے یہ معنے ہی نہیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی کوئی بیوی خدا سے دور ہو گئی تھی۔ بلکہ اسکے یہ معنے ہیں کہ ان کا دل بالکل خدا کی طرف متوجہ تھا اور جو غلطی ہوئی تھی محض سہواً تھی پس یہ اعتراض اجگہ پڑتا ہی نہیں۔

تیسرا جواب اس کا یہ ہے کہ یہ آیت تو قرآن کریم کی ہے۔ امام بخاریؒ کی روایت تو نہیں جسپر اعتراض ہے۔ پس اعتراض امام بخاری پر نہیں اللہ تعالےٰ پر ہے۔ اس میں کیا شک ہو سکتا ہے کہ یا تو اس آیت کے معنے برے ہیں یا اچھے۔ اگر اسکے یہ معنے ہیں کہ آپکی دو بیویاں خدا سے پھر گئی تھیں۔ اور اگر یہ درست ہے کہ خدا سے دور ہونیوالی بیویاں نبی کی زوجیت میں نہیں رہ سکتیں تو پھر امام بخاری ہی کا یہ فرض نہیں کہ وہ یہ بتائیں کہ پھر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ان دو بیویوں کو الگ کیوں نہ کر دیا۔ بلکہ مصنف ہفوات کا بھی جبتک وہ مسلمان کہلاتے ہیں فرض ہے کہ بتائیں کہ پھر رسول اللہ صلعم نے خدا کے حکم کے خلاف کام کیوں کیا۔ پس ان کا یہ اعتراض بخاری پر نہیں بلکہ درحقیقت قرآن کریم پر ہے کیونکہ فقد صغت قلوبکما بخاری کی روایت نہیں بلکہ قرآن کریم کی آیت کا ایک حصہ ہے۔

اور اگر اس آیت کے معنے اچھے ہیں اور اس میں ازواج مطہرات کی تعریف کیگئی ہے تو پھر مصنف ہفوات نے اس آیت کی بنا پر اعتراض کیوں کیا ہے۔ جب بیویاں نیک تھیں تو ان کے علیحدہ کرنے یا نہ کرنے کا سوال ہی کس طرح پیدا ہو سکتا ہے؟

تیسرا اعتراض مصنف ہفوات کا یہ ہے کہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی بیویاں آپ پر ایسی زیادتیاں کریں کہ کئی کئی دن تک آپ غم و غصہ میں مبتلا رہیں اور کار رسالت سے معطل رہیں۔

اس اعتراض سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف صاحب ہفوات کا دماغ قوت ایجاد کا وافر حصہ رکھتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ ناپسند اور مکروہ باتوں کی ایجاد ہی میں مشغول رہتا ہے۔ اوّل تو حدیث میں کوئی ایسا لفظ موجود نہیں جس میں ازواج مطہرات کی زیادتیوں کا ذکر ہو۔ حدیث کے الفاظ سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ عرب کے دستور کے خلاف اس حریت کی روشنی میں جو اسلام نے پھیلائی تھی۔ اور ان محبت کے تعلقات کے نتیجہ میں جو میاں بیوی میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پیدا کرنا چاہتے تھے۔ آپکی بیویاں بعض دفعہ بعض معاملات میں آپکو مشورہ دیدیا کرتی تھیں اور بعض دفعہ اس تعلق محبت کی بنا پر آپ پر اپنی بات کے منوانے کے لئے زور بھی دیدیا کرتی تھیں۔ کیا اس بات کا نام کوئی شخص زیادتی رکھ سکتا ہے؟ حدیث میں الفاظ مراجعن کے ہیں یعنے بات کا جواب دینا۔ اور واقع بتلاتا ہے کہ جواب دینے سے کیا مراد ہے۔ کیونکہ یہ بات حضرت عمرؓ کی بیوی پلنے کہی ہے اور اس کا واقعہ حضرت عمرؓ یہ بیان فرماتے ہیں کہ آپ کسی بات کو سوچ رہے تھے کہ آپکی بیوی نے مشورۃً کوئی بات کہدی کہ جس امر میں آپکو فکر ہے۔ آپ اس میں اس اس طریق سے کام کرسکتے ہیں۔ حضرت عمرؓ کو دستور عرب کے مطابق عورت کا مشورہ میں دخل دینا ناپسند ہوا ہے اور آپنے اسے ڈانٹا اسپر اسنے کہا کہ آپ کیوں ناراض ہوتے ہیں؟ اس طرح تو آپکی بیٹی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی کر لیا کرتی ہے پس مراجعت کے معنے خود الفاظ حدیث سے ہی کھل جاتے ہیں یعنے بات میں دخل دے لینا نہ کہ تو تو میں میں کرنا اور لڑنا جو مضمون کہ مصنف ہفوات نکالنا چاہتے ہیں حضرت عمرؓ کی بیوی نے کب حضرت عمرؓ کی کسی بات کو رد کیا تھا کہ اسکی نسبت یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اگر اس کے لئے یہ لفظ صرف مشورہ دینے پر بولا گیا ہے۔ تو اس حدیث میں وہی لفظ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

کی بیویوں کی نسبت استعمال ہوا ہے تو اس کے وہی معنے کیوں نہ کئے جاویں اور کیوں اسکے معنے زیادتی کے کئے جاویں؛

باقی رہا یہ کہ رسول کریم صلعم کی نسبت بھی کہا گیا ہے کہ آپ اس جواب سے دن بھر ناراض رہتے تھے تو اول تو یہ حضرت عمرؓ کی بیوی کے لفظ ہیں اور ان کی تصدیق نہ حضرت عمرؓ نے کی ہے نہ حضرت حفصہؓ نے کیونکہ جب اُنھوں نے حضرت حفصہؓ کے سامنے واقع بیان کیا ہے تو انہوں نے اس امر کی تو تصدیق کی ہے کہ ہم آپ سے اصرار کرکے بات کرلیا کرتی ہیں لیکن اس کا اقرار نہیں کیا کہ آپؐ بھی سارا سارا دن ناراض رہتے ہیں پس یہ ایک عورت کا خیال ہے اور اگر ہم یہ کہدیں کہ یہ خیال غلط تھا تو حدیث کی صحت یا امام بخاری کی شخصیت پر کوئی اعتراض نہیں پڑتا۔

دوسرے اگر اس امر کو نظر انداز بھی کردیا جائے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ناراض رہنے کو بطور واقع بیان نہیں کیا گیا بلکہ ایک عورت کے خیال کے طور پر بیان کیا گیا ہے جس کی حضرت حفصہ تصدیق نہیں کرتیں تو بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں آپ پر کوئی زیادتی کرتی تھیں بلکہ صرف ثابت ہوتا ہے کہ وہ مشورہ میں کوئی ایسی بات کہہ بیٹھتی تھیں جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک کبھی مناسب نہیں ہوتی تھی۔ اور آپ اسپر ناپسندیدگی کا اظہار فرمادیتے تھے اور یہ بات ان دو شخصوں کے تعلقات میں جو اخلاق اور علم میں فرق رکھتے ہوں پیدا ہو جانی بالکل معمولی ہے۔

دوسری ایجاد مصنف صاحب ہفوات کے دماغ کی یہ ہے کہ حدیث میں تو یہ لفظ ہیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اس دن ناراض رہتے اور وہ اپنے اعتراض میں لکھتے ہیں کہ کئی کئی دن تک آپ غم و غصّہ میں مبتلا رہتے تھے۔

تیسری ایجاد مصنف ہفوات کی یہ ہے کہ حدیث میں تو لفظ غضب کا استعمال ہوا ہے جو اچھے اور بُرے دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کی نسبت بھی استعمال ہوجاتا ہے جیسا کہ آتا ہے من لعنہ اللہ و غضب علیہ اور انہوں نے

اس لفظ کو بدل کر غم و غصہ کا لفظ استعمال کر دیا ہے تاکہ اعتراض مضبوط ہو جائے۔ کیونکہ غصہ کا لفظ عربی زبان میں بُرے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور اس لفظ کا مفہوم یہ ہے کہ جس شخص کے اندر یہ مادہ جوش میں آوے خود اُسکو تکلیف ہو اور اس کا گلا گھُٹ جائے۔ اور یہ حالت صرف ان لوگوں کی ہوتی ہے جو جوش سے اندھے ہو جائیں اور ماسوا کو بھول جائیں۔ قرآن کریم میں یہ لفظ انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ دوزخیوں کے کھانے کی نسبت آتا ہے وطعامًا ذا غصّۃ وہ کھانا اُن کو ملیگا جو ان کے گلے کو پکڑ لیگا اور نہ باہر نکل سکیگا نہ اندر جا سکیگا۔

لغت میں بھی یہی معنے کیئے ہیں کہ غصہ اس حزن کو کہتے ہیں جو انسان کے گلے کو پکڑے یعنی اس کی حالت موت کی سی کر دے جیسے کسی کا گلا بند ہو جائے۔ پس یہ لفظ اللہ تعالیٰ اور اس کے نیک بندوں کی نسبت استعمال نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس کا مفہوم ان کے اندر نہیں پایا جاتا۔ اور حدیث میں یہ لفظ رسول کریم کی نسبت استعمال نہیں ہوا بلکہ غضب کا ہوا ہے جو اللہ تعالیٰ کی نسبت بھی استعمال ہو جاتا ہے۔

مصنف ہفوات کے دماغ کی چوتھی اختراع یہ ہے کہ وہ اس حدیث سے یہ مطلب نکالتے ہیں کہ چونکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی نسبت لکھا ہے۔ آپ اپنی بیویوں کی بات پر اظہار غضب کرتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ کار رسالت سے معطل ہو جاتے تھے۔ حالانکہ غضب کرنے اور کار رسالت سے معطل ہونے کا کوئی بھی علاقہ نہیں ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ جسطرح مصنف ہفوات نے محبت کا غلط مفہوم سمجھکر پہلی حدیث پر اعتراض شروع کر دیا تھا اسیطرح غضب کا غلط مفہوم سمجھکر دوسری حدیث پر اعتراض شروع کر دیا۔ اگر وہ قرآن کریم پر نظر ڈالتے تو ان کو اس قسم کے اعتراضات کر کے خود سُبکی نہ اُٹھانی پڑتی اور دشمنانِ اسلام کو خوشی کا موقعہ نہ ملتا۔ میں ابھی لکھ چکا ہوں کہ یہ لفظ اللہ تعالیٰ کی نسبت قرآن کریم میں بار بار استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ بعض آیات اور لکھ دیتا ہوں جن سے معلوم ہوگا کہ خدا تعالیٰ بھی غضب کرتا ہے۔ سورۂ مجادلہ میں فرماتا ہے تولوا قومًا غضب اللہ علیہم (ع ۳) سورۂ نساء میں ہے۔ وغضب اللہ علیہ ولعنہ (ع ۱۳) سورۂ فتح میں ہے۔

وغضب اللہ علیھم (۶) اور اگر مصنف ہفوات نماز کے فریضہ کے ادا کرنیکی طرف بھی کبھی متوجہ ہوتے ہیں تو ان کو معلوم ہونا چاہیئے کہ سورہ فاتحہ جسے ایک مسلمان کم سے کم بتیس ۳۲ دفعہ دن میں پڑھتا ہے اس میں غیر المغضوب علیہم ایک قوم کی نسبت آتا ہے۔ اور اس غضب کی مدت قیامت تک ہے جیسا کہ فرماتا ہے واذ تأذن ربك ليبعثن عليهم الى يوم القيمة من يسومهم سوء العذاب ان ربك لسريع العقاب وانه لغفور الرحيم۔ اعراف ع ۲۱۔ ترجمہ:۔ جب تیری ربنے خبر دیدی کہ وہ ان لوگوں پر قیامت تک ایسے لوگ مقرر کرتا رہیگا جو ان کو سخت عذاب دیتے رہینگے۔ ضرور تیرا رب جلد بُرے کام کا بدلہ دینے والا ہے۔ اور وہ ساتھ ہی بہت بخشنے والا اور مہربان بھی ہے۔ اب اگر غضب کرنیوالا اپنے کام سے معطل ہو جاتا ہے اور اسی صورت میں وہ غضب کر سکتا ہے جب اور کسی کی بات کی اسے ہوش نہ رہے تو کیا اللہ تعالے بھی اپنے کام سے معطل ہو جاتا ہے۔ اور اگر باوجود اس کے کہ یہ لفظ بار بار اللہ تعالیٰ کی نسبت استعمال ہوا ہے اللہ تعالیٰ کی شان میں کچھ فرق نہیں آتا تو کیا رسول کی شان خدا سے بڑھکر ہے کہ اگر اس کی نسبت یہ لفظ استعمال ہو جائے تو اس کی شان میں فرق آجاتا ہے۔

اگر یہ کہو کہ خدا تعالیٰ کی نسبت تو یہ الفاظ بطور استعارہ اور مجاز استعمال ہوتے ہیں اور بندوں کی نسبت اصل معنوں میں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ کوئی قاعدہ ایسا نہیں جس میں استعارہ اور مجاز کے استعمال کے لئے یہ حد لگائی گئی ہو کہ فلاں کیلئے وہ استعمال ہو سکتا ہے اور فلاں کیلئے نہیں۔ اگر اللہ تعالے کیلئے یہ لفظ بطور استعارہ استعمال ہوتے ہیں تو وہی لفظ اگر اللہ تعالے کے رسول کی نسبت آگیا ہے تو اسکے حقیقی معنے اگر رسول کی شان کے خلاف ہیں تو ہم اسی طرح اسجگہ اسکے مجازی معنے لے لیں گے جس طرح اللہ تعالے کی نسبت اسکے مجازی معنے لیتے ہیں۔

دوسرا جواب اس کا یہ ہے کہ مجاز اور استعارہ کے طور پر وہی لفظ کسی قدوس

اور پاک ہستی کی نسبت استعمال کیا جاتا ہے جو پاک ہو۔ پس اگر مجازاً بھی غضب کا لفظ اللہ تعالےٰ کیلئے استعمال کیا جاتا ہو تب بھی یہ ماننا پڑیگا کہ وہ لفظ اعلیٰ سے اعلیٰ انسان کیلئے بولنا اس کی شان کے خلاف نہیں۔ پس رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی نسبت اس لفظ کا استعمال آپکی شان کے خلاف نہیں۔ کیونکہ یہ کسی عیب پر یا کمزوری پر دلالت نہیں کرتا بلکہ غضب اس موقعہ پر ایک خوبی ہے جس کا پایا نہ جانا بے غیرتی پر دلالت کرتا ہے۔

مگر مصنف صاحب ہفوات کی تسلی کیلئے ہم استعارہ اور مجاز کے عذر کو بھی قبول کر لیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے سوا انبیاء اور نیک لوگوں کے لئے اس لفظ کا استعمال قرآن کریم میں دکھا دیتے ہیں۔ سورۂ اعراف میں یہی لفظ حضرت موسیٰؑ کی نسبت آتا ہے۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے ولما رجع موسیٰ الی قومہ غضبان اسفا قال بئسما خلفتمونی من بعدی۔ ع ۱۸۔ اور جب موسیٰؑ اپنی قوم کی طرف ایسی حالت میں لوٹے کہ وہ ان پر غضبناک تھے اور ان کی حالت پر افسوس کر رہے تھے انہوں نے کہا کہ تم لوگوں نے میرے بعد میری جانشینی بہت بری طرح کی ہے۔ اسکے آگے چلکر فرمایا ہے ولما سکت عن موسی الغضب اخذ الالواح۔ ع ۱۶۔ اور جب موسیٰ کا غضب ٹھہر گیا تو اُنہوں نے تختیاں لیلیں۔ کیا ان آیات کے مطابق یہ سمجھنا چاہئے کہ نعوذ باللہ حضرت موسیٰ طور سے واپس آئے اور اپنی قوم کے سمجھانے کے عرصہ میں کار نبوت سے معطل رہے تھے۔ اگر نہیں تو رسول کریم کی نسبت یہی لفظ اگر استعمال کیا گیا ہے تو اسکے معنی کار نبوت سے معطل ہونے کے کیونکر ہوگئے۔ کیا اس لئے کہ مصنف ہفوات نے امام بخاری کے پردہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات کو برا بھلا کہنے کی ایک سبیل نکالی ہے یا کم سے کم یہ کہ حدیثوں کی برائی ثابت کرنا ان کا اصل مقصد نہیں بلکہ اصل میں صحابہ اور ائمہ دین کو گالیاں دیکر اپنی طبیعت ثانیہ کے مقتضے کو پورا کرنا مطلوب ہے۔

حضرت موسیٰ کے علاوہ یہی لفظ ایک اور نبی کی نسبت بھی استعمال ہوا ہے اور

وہ یونس نبی ہیں جنکو قرآن کریم میں ذوالنون کے لقب سے بھی یاد کیا ہے۔ ان کی نسبت سورۂ انبیاء میں آتا ہے وذاالنون اذ ذهب مغاضبا فظن ان لن نقدر علیہ فنادی فی الظلمت ان لا الٰہ الا انت سبحانك انی کنت من الظالمین ۔ع ۶۔ اور ذوالنون کو بھی (ہمنے ہدایت دی تھی) جبکہ وہ غضبناک ہوکر اپنے علاقہ سے چلا اور اسے یقین تھا کہ ہم اسکے ساتھ سختی کا معاملہ نہیں کرینگے پس اس یقین کی بنا پر اسنے مصائب کے وقت پکار کر کہا تیرے سوا کوئی اور معبود نہیں تو پاک ہے اور میں تو ظالموں میں سے ہوں (یعنے اپنے نفس کو ہینے دکھ میں ڈال دیا ہوا ہے) اس آیت میں بھی ایک نبی کی نسبت غضب کا لفظ استعمال ہوا ہے مگر باوجود اس کے وہ کار نبوت سے معطل نہیں ہوا بلکہ نبی ہے اور نبیوں والا کام کر رہا ہے۔ لوگوں سے ناراض ہے مگر اللہ کی مدد کا کامل بھروسہ رکھتا ہے۔ دنیا کی تنگی کو دیکھکر بھی یقین رکھتا ہے کہ خدا مجھے نہیں چھوڑیگا اور اس کی امداد کے حصول کیلئے اس کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے اور اسکے لئے الٰہی رحمت کا دروازہ کھولا جاتا ہے۔

یہی غضب کا لفظ مؤمنوں کی نسبت بھی استعمال ہوا ہے اور بصورت مدح استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ سورۂ شوریٰ میں فرمایا ہے۔ واذا ما غضبوا هم یغفرون۔ ع ۴۔ جب ان کو کسی پر غضب آتا ہے تو اپنے غضب کے نتیجہ میں لوگوں کو سزا نہیں دیتے بلکہ باوجود غضب کے ان کے رحم کا پہلو غالب رہتا ہے اور وہ دوسرے کے قصوروں کو معاف کر دیتے ہیں۔ اسجگہ دیکھو مؤمنوں کی تعریف میں یہ بات بیان ہوئی ہے کہ وہ غضب کے وقت سزا سے ہاتھ کھینچے رکھتے ہیں۔ اگر غضب کے معنے کار رسالت سے معطل ہونے کے ہوتے تو یہ مؤمن کار مؤمنیت سے کیوں معطل نہوجاتے اسجگہ سے تو معلوم ہو رہا ہے کہ غضب کے باوجود ایک مؤمن کا تعلق ایمان بھی قایم رہتا ہے اور وہ اللہ تعالےٰ کی صفات کی جلوہ گری اپنے اندر پاتا ہے اور اس کے رحم کو اپنے اندر منعکس کرکے وہ لوگوں کے گناہ معاف کرتا ہے۔ تو پھر کیا نبیوں کے دل کا ظرف ہی اس قدر تنگ ہے کہ اس میں غضب کے آتے ہی باقی سب حواس

وہاں سے غائب ہو جاتے ہیں اوران کو پھر دنیا و مافیہا بلکہ خدا اور عقبیٰ کی بھی کچھ فکر نہیں رہتی اور وہ کار نبوت سے معطل ہو جاتے ہیں۔ اس عقل و دانش پر تعجب ہے اور اس علم پر ائمہ پر اعتراض کرنے کی جرأت موجب حیرت ہے۔ اور اس ستم ظریفی پر عقل دنگ ہے کہ آپ بایں علم و فہم لکھتے ہیں کہ ان ہفوات کو عقل انسانی ہرگز قبول نہیں کرتی۔

تیسری روایت مصنف ہفوات نے اس امر کی سند میں کہ ائمہ حدیث کے نزدیک رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو حضرت عائشہ رض سے عشق تھا بخاری کتاب النکاح سے نقل کی ہے۔ یہ روایت درحقیقت اسی واقعہ کے متعلق ہے جو اوپر بیان ہو چکا ہے اسلئے واقعہ کی طرف اشارہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس میں سے یہ الفاظ نقل کر کے مصنف ہفوات نے اعتراض کیا ہے ثم قلت یا رسول اللہ لو رأیتنی و دخلت علی حفصۃ فقلت لہا لا یغرنّک ان کانت جارتک اوضا منک و احب الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم یرید عائشۃ رض فتبسم النبی صلی اللہ علیہ وسلم تبسمۃ اخری۔ میں نے کہا یا رسول اللہ دیکھئے تو سہی میں حفصہ کے پاس گیا اور میں نے اس سے کہا تجھے کوئی بات دھوکا نہ دے کیونکہ تیری ہمسائی تجھ سے رسول کریم ؐ کو زیادہ خوش رکھنے والی اور زیادہ پیاری ہے (جس سے ان کی مراد حضرت عائشہ رض تھیں) پس نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم دوبارہ اپنے خاص طرز میں مسکرائے۔ مصنف ہفوات اس پر اعتراض کرتے ہیں کہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم عوام کی طرح مبتلائے نفس امارہ تھے۔ اس عقل و دانش پر مجھے تعجب آتا ہے۔ اگر اس کا نام نفس امارہ ہے کہ کسی شخص سے جس سے خدا تعالےٰ نے رشتۂ محبت پیدا کیا ہے محبت کی جائے تو پھر وہ سب روایات جن میں حضرت علی رض اور حضرت فاطمہ رض اور حضرت حسن رض اور حضرت حسین رض سے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی محبت کا ذکر آتا ہے وہ سب ہی نفس امارہ کی غلامی پر دلالت کرتی ہیں۔ نعوذ باللہ من ذٰلک۔ اور اگر کسی شخص سے دوسروں کی نسبت زیادہ محبت کرنا نفس کی غلامی ہے تو لیوسف و اخوہ احب الی ابینا منا (یوسف ع ۱) کی آیت

سے ماتحت حضرت یعقوب نعوذ باللہ من ذالک۔ نفس امارہ کے غلام ٹھہرے۔ افسوس کہ انسان تعصب میں اندھا ہو کر بالکل غور نہیں کر سکتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔

مجھے اس اعتراض پر اور کچھ زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ محبت کے مضمون پر میں پہلے تفصیلاً لکھ آیا ہوں۔ ہاں یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ اس حدیث کو نقل کر کے مصنف ہفوات نے جو چند فقرات بزعم خود اسکے مضمون کو رد کرنے کیلئے لکھے ہیں ان سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ان صاحب کا عندیہ اصل میں کیا ہے اور اس کتاب کی تصنیف کی حقیقی غرض کیا ہے۔ آپ لکھتے ہیں۔ اس روایت کو ابن عباس سے کتاب المظالم میں بھی بیان کیا گیا ہے۔ لیکن اس حدیث میں حضرت عائشہ و حفصہ رضی اللہ عنہما کے راز فاش کرنے پر عتاب فرمانے کا بھی ذکر ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اوپر کی عشق بازی کی احادیث لغو و بہتان ہیں۔ دوم ابن ماجہ جلد سوم باب اسم اللہ الاعظم صفحہ ۲۲۵ میں حضرت عائشہ رض سے منقول ہے کہ آنحضرت صلعم نے اسم اعظم کی تعریف کی تو حضرت عائشہ رض فرماتی ہیں کہ میں نے اس کے سکھانے کی فرمائش دوبار کی لیکن آپ نے انکار فرمایا۔ سوم مولوی حسن الزمان صاحب حیدرآبادی کی کتاب قول مستحسن کے صفحہ ۲۰۲ میں عوام بن حوشب کی روایت ہے کہ جناب عائشہ نے حضرت فاطمہ اور حسن و حسین کے ساتھ چادر تطہیر میں گھسنے کی درخواست کی تو آنحضرت نے فرمایا ہٹ جا۔

ان روایات کے نقل کرنے سے مصنف کتاب کا منشاء سوائے حضرت عائشہ رض کی تحقیر کے اور کیا ہو سکتا ہے۔ اور جو شخص بھی بلا تعصب کے اس کتاب کو پڑھیگا اسے ماننا پڑیگا کہ یہی ان کا منشاء ہے۔

گو اس کتاب کے موضوع سے چنداں اسے تعلق نہیں۔ لیکن چونکہ ان اعتراضات کو میں نے اس جگہ درج کر دیا ہے انکا جواب بھی اس جگہ دیدینا مناسب سمجھتا ہوں۔ امر اول۔ یعنی حضرت عائشہ رض اور حضرت حفصہ پر عتاب کا ہونا کوئی قابل اعتراض بات نہیں۔ وہ عتاب خراب ہوتا ہے جو شرارت پر کیا جائے۔ لیکن جو عتاب غلطی پر کیا جائے وہ تو ایک سبق اور نصیحت ہے۔ نبی دنیا میں سکھانے کے لئے آتے ہیں۔ لوگوں میں کمزوریاں

ہوتی ہیں تبھی ان کی بعثت کی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر اس سے بڑے درجہ کے لوگوں کے لئے علوم روحانیہ کے سمجھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر کسی جگہ وہ ٹھوکر کھا جائیں تو ان کو تنبیہ ہوتی ہے اور یہ تنبیہ بطور تلطف ہوتی ہے نہ بہ نظر تحقیر و عذاب۔ پس اگر حضرت عائشہ رض اور حضرت حفصہ رض کو جو تنبیہ ہوئی ہے وہ عتاب میں ہے تو کوئی ہرج نہیں خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان کا دل خدا ہی کی طرف مائل تھا پس یہ تنبیہ ان کی عظمت پر دلالت کرتی ہے اور اللہ تعالےٰ کی خاص توجہ کی علامت ہے۔

دوسرا اعتراض کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رض کو اسم اعظم نہیں سکھایا۔ اصل مضمون سے تعلق نہیں رکھتا۔ یہ بات کہ کسی شخص کو کسی دوسرے شخص سے سخت محبت ہے اس امر کا موجب نہیں ہوتا کہ وہ اسے ہر ایک بات بتادے۔ مگر اس بات کے بیان کرنے سے چونکہ آپکی یہ نیت ہے کہ حضرت عائشہ رض کی عظمت کو لوگوں کی نظروں میں کم کریں اسلئے میں اس کا جواب دیدینا بھی مناسب سمجھتا ہوں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ابن ماجہ میں حضرت عائشہ رض سے یہ روایت مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رض کو اسم اعظم نہیں سکھایا لیکن اس روایت سے یہ نتیجہ نکالنا کہ اسم اعظم کوئی خاص شئے ہے جو نہایت پیاروں کو سکھائی جاتی ہے ایک حماقت کی بات ہے۔ اسم اعظم کوئی خاص شئے نہیں بلکہ اسم اعظم کے متعلق اس قسم کا خیال مسلمانوں میں یہود سے آیا ہے جو یہوواکے نام کا تلفظ اس قدر مشکل سمجھا کرتے تھے کہ سوائے عالموں کے دوسروں کے لئے اس نام کا لینا یا اس کا سکھانا جائز نہیں جانتے تھے (دیکھو جونش انسائکلوپیڈیا و انسائکلوپیڈیا ببلیکا زیر لفظ نیمز) اور انکا یہ خیال تھا کہ اس نام کو صحیح طور سے جو شخص بول سکے اس کی ہر ایک غرض پوری ہو جاتی ہے۔ مسلمانوں میں جب دیگر اقوام سے میل جول کے نتیجہ میں ان کے خیالات اور وساوس داخل ہو گئے تو یہ خیال بھی یہود سے داخل ہو گیا اور صرف اسلامی الفاظ کے پردہ میں یہ یہودی عقیدہ عام مسلمانوں میں راسخ ہو گیا۔ ورنہ یہ خیال کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی ایسا نام ہے جو اسکے بندوں کے لئے مفید ہے اسکے انبیاء جو

ہر ایک چیز کو جو انسانوں کے لئے مفید ہو ظاہر کر دیتے ہیں۔ اس نام کو چھپائے رکھتے ہیں۔ خدا اور اسکے رسولوں کی ہتک ہے۔ اسم اعظم درحقیقت اللہ کا لفظ ہے جو اسم ذات ہے اور تمام اسماء اسکے ماتحت ہیں اور اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ ہاں مختلف اشخاص کو ان کے مخصوص حالات کے مطابق بعض خاص اسماء سے تعلق ہوتا ہے اسوقت ان ناموں کو یاد کرکے دعا کرنا ان کے لئے بہت مفید ہوتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے وللہ الاسماء الحسنیٰ فادعوہ بھا۔ اس وقت موقع کے لحاظ سے ان اشخاص کیلئے وہی اسماء جنکو بلانیسے انکی حاجت روائی ہوتی ہو انکے لئے اسم اعظم بنجاتے ہیں خود ان حدیثوں کے ساتھ جو اور احادیث اسم اعظم کے متعلق مذکور ہیں انہیں سے معلوم ہوتا ہے کہ اسم اعظم سے مراد کوئی خاص پوشیدہ نام نہیں ہے چنانچہ اس حدیث کے ساتھ ہی عبد اللہ بن بریدۃ کی روایت درج ہے کہ ان سے ان کے والد نے بیان کیا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے کسی شخص کو کہتے سُنا۔ اللھم انی اسئلك بانك انت اللہ الاحد الصمد الذی لم یلد ولم یولد ولم یکن له کفوا احد۔ اسپر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لقد سأل اللہ باسمه الاعظم الذی اذا سئل به اعطےٰ واذا دُعی به اجاب۔ اس نے اللہ تعالیٰ کو اسکے اسم اعظم سے پکارا ہے جس کے ذریعہ سے پکارنے پر وہ سوال کو قبول کرتا اور پکار کا جواب دیتا ہے۔ پھر ساتھ ہی انس بن مالک کی روایت درج ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو یہ کہتے سُنا کہ اللّٰھم انی اسئلك بانّ لك الحمد لا الٰه الا انت وحدك لا شریك لك المنّان بدیع السمٰوٰت والارض ذوالجلال والاکرام تو فرمایا کہ لقد سأل اللہ باسمه الاعظم الذی اذا سئل به اعطےٰ واذا دُعی به اجاب یعنی اسنے خدا تعالےٰ کو اس کے اس اسم اعظم سے پکارا ہے کہ اگر اسکے ذریعہ سے اس سے سوال کیا جائے تو وہ دیتا ہے اور اگر اسے پکارا جائے تو وہ جواب دیتا ہے۔

ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ (۱) اسم اعظم کسی ایک اسم کا نام نہیں بلکہ ان اسماء کا نام ہے جن سے کسی خاص وقت میں دعا مانگنی زیادہ مفید ہوتی ہے۔ کیونکہ مختلف

لوگوں نے مختلف دعاؤں اور ناموں سے اللہ تعالیٰ کو مخاطب کیا ہے اور ان کا نام رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسم اعظم رکھا ہے (۲) یہ اسم اعظم کوئی پوشیدہ امر نہیں ورنہ رسول کریم لوگوں کو یہ کیوں بتاتے کہ ان لوگوں نے اسم اعظم کو یاد کر کے دعا مانگی ہے۔ آپکو تو چاہیئے تھا کہ اگر اتفاقاً کسی کے منہ سے اسم اعظم نکل گیا تھا تو چپ کر رہتے۔ (۳) جبکہ آپ علی الاعلان اسم اعظم کی تلقین کرتے تھے تو ممکن نہ تھا کہ حضرت عائشہ رضؓ سے چھپاتے کیونکہ وہ دوسروں سے سن سکتی تھیں۔

اصل بات یہ ہے کہ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں بعض لوگوں کی خاص حالت کے مطابق بعض اسماء ہوتے ہیں اور وہی ان کے لئے اسم اعظم ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس حدیث میں جسپر صاحب ہفوات نے اعتراض کیا ہے اسی قسم کے اسم کا ذکر ہے اور اس میں یہ جو بیان ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضؓ سے ذکر کیا کہ اللہ تعالےٰ نے مجھے وہ نام بتایا ہے جس کے ذریعہ سے اگر اس سے دعا کی جائے تو وہ قبول کرتا ہے اس سے مراد آپکی اسی اسم سے تھی جو آپ کے ذاتی امور کے ساتھ مناسبت رکھتا تھا یہ اسم یا بطور الہام یا بطور القاء ہی معلوم کرایا جاتا ہے۔ حضرت عائشہ رضؓ نے اس سے فائدہ اٹھا کر کسی ایسے امر کے متعلق دعا کرنی چاہی ہے جو ان میں اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے درمیان مشترک تھا چونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس وقت معلوم ہو چکا تھا کہ وہ امر اللہ تعالےٰ کی مشیت کے خلاف ہے آپنے حضرت عائشہ رضؓ کو وہ نام نہیں بتایا کہ کہیں جوش میں اس امر کے متعلق وہ دعا نہ کر بیٹھیں۔ لیکن حضرت عائشہ رضؓ نے اپنے عمل سے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی کامل اطاعت کا ثبوت دیدیا۔ اور ایسی جامع مانع دعا کی جو اسم اعظم پر مشتمل تھی اور خدا تعالےٰ سے کوئی دنیاوی چیز نہیں مانگی بلکہ اس کی مغفرت اور رحم ہی مانگا۔ چنانچہ اس حدیث میں آتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ رضؓ کی دعا پر ہنس پڑے اور فرمایا کہ اسم اعظم تیری دعا میں شامل تھا۔ پس جبکہ حضرت عائشہ رضؓ کی زبان پر بسبب ان کی کامل اتباع کے اللہ تعالےٰ نے خود بطور القاء کے وہ اسم جاری کر دیا جو ان کے مناسب حال تھا۔ تو کیسا نادان ہے

وہ شخص جو حضرت عائشہ رض کے درجہ پر اس حدیث کے ذریعہ سے اعتراض کرتا ہے
یہ حدیث تو آپ کے بلند درجہ اور اعلیٰ مقام پر دلالت کرتی ہے اور آپ کو جو محبت رسول کریم
صلی اللہ علیہ وسلم سے تھی اسپر شاہد ہے نہ کہ اس سے آپکی شان کے خلاف کوئی استدلال
ہوتا ہے۔

اسکے بعد آپنے حضرت عائشہ رض سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کی نفی کے
ثبوت میں قول مستحسن کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ عمیر بن حوشب کی روایت ہے کہ جب
عائشہ رض نے حضرت فاطمہ اور حسن اور حسین کے ساتھ چادر تطہیر میں داخل ہونے کی
درخواست کی تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پرے ہٹ جا۔ اس روایت کے
متعلق مجھے اس سے زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ چادر تطہیر شیعہ محاورہ ہے۔
چادر تطہیر کا ثبوت قرآن کریم سے نہیں ملتا۔ قرآن کریم میں تو ایک وعدہ تطہیر بیان
ہوا ہے اسکا کسی چادر کے ساتھ تعلق نہیں۔ شیعان علی نے نہیں کیونکہ وہ نیک اور
پارسا لوگ تھے بلکہ بعض شیعان نفسانیت نے اہل بیت کے معنے حقیقت سے پھیرنے
کے لئے جو روایات گھڑی ہیں ان میں چادر تطہیر کا ذکر آتا ہے اور ان کی عبارتیں ہی
بتاتی ہیں کہ ان سے محض امہات المؤمنین کی ہتک اور لوگوں کی عقل پر پردہ ڈالنا
مقصود ہے۔ قرآن کریم میں صریح طور پر بیویوں کو اہل بیت کہا گیا ہے۔ چنانچہ سورہ ہود
میں ان رسولوں کے ذکر میں جو لوط کی قوم کی ہلاکت کیلئے مبعوث ہوئے تھے حضرت
سارہ کو جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی تھیں اہل بیت کہکر پکارا گیا ہے وہ لوگ
حضرت سارہ کو مخاطب کرکے کہتے ہیں اتعجبین من امر اللہ رحمت اللہ وبرکاتہ علیکم
اھل البیت انہ حمید مجید۔ ھود ع ۷۔ یعنی کیا تو تعجب کرتی ہے اللہ کے فیصلہ
پر تمہیں تو اے اہل بیت اللہ تعالےٰ کی رحمتیں اور اس کی برکات ہیں۔ اللہ تعالےٰ یقیناً
بہت تعریف والا اور بڑی بزرگیوں کا مالک ہے۔ لیکن ان روایات میں صاف الفاظ
میں بیویوں کے اہل بیت ہونے سے انکار کیا گیا ہے۔ پس ان خلاف قرآن روایات کو
کون مسلمان تسلیم کر سکتا ہے۔ یہ اقوال نبی کریم صلعم کے نہیں ہیں۔ بلکہ ان لوگوں کی

افترا پردازیاں ہیں جو باوجود سخت وعیدوں کے رسول کریم صلعم پر جھوٹ باندھنے سے نہیں جھجکتے تھے۔

مگر جھوٹ چھپ نہیں سکتا۔ اول تو قرآن کریم سے ہی انکی یہ روایات ٹکرا جاتی ہیں اور اسلئے قابل قبول نہیں۔ دوسرے خود آپس میں یہ روایتیں سخت ٹکراتی ہیں۔ مثلاً یہی واقعہ پندرہ بیس راویوں سے مذکور ہے اور مختلف روایتوں میں اس قدر سخت اختلاف ہے کہ انمیں تطبیق کی کوئی صورت نہیں حضرت ام سلمہؓ کی طرف یہ قول منسوب کیا گیا ہے کہ یہ آیت انکے گھر میں نازل ہوئی ہے حضرت عائشہؓ کی طرف منسوب کیا گیا ہے کہ گویا انکے گھر نازل ہوئی ہے کسی روایت میں ہے کہ جس وقت آیت تطہیر اتری تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہؓ اور حضرت حسینؓ اور علیؓ کو ام سلمہ کے گھر میں بلاکر ان کو چادر میں داخل کیا۔ کسی میں ہے کہ آپ نے خود ان کے گھر میں جاکر ان کو ایک چادر میں جمع کرکے ان پر یہ آیت پڑھی۔ پھر کسی روایت میں ہے کہ ام سلمہ فرماتی ہیں کہ میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا تھا کہ مجھے اس چادر میں داخل کرو اور آپ نے داخل نہ کیا۔ اور کسی میں ہے کہ عمیر بن حوشب کہتے ہیں کہ عائشہؓ نے کہا تھا کہ مجھے داخل کرو اور آپ نے داخل نہ کیا۔ اس اختلاف سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل بیت کی محبت کا جھوٹا دعوے کرنیوالوں نے وقتی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے یہ روایات بنائی ہیں اسلئے دروغگو را حافظہ نہ باشد کے اصل کے مطابق وہ اپنے بیان میں کوئی ما بہ الاشتراک پیدا نہیں کرسکے۔ کیا یہ تعجب کی بات نہیں کہ ایک روایت میں تو یہ بیان ہوتا ہے کہ ام سلمہ نے کہا کہ میں نے خود چادر تطہیر میں داخل ہونا چاہا اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا۔ مگر عمیر بن حوشب کی روایت کے مطابق حضرت عائشہؓ نے داخل ہونا چاہا مگر اجازت نہ ملی۔ کیا یہ اس امر کا ثبوت نہیں کہ ایک وضاع نے اگر حضرت ام سلمہؓ کی ہتک کرنی چاہی ہے۔ تو دوسرے نے حضرت عائشہؓ کی۔

علاوہ ازیں حضرت عائشہؓ کی جو حدیث مصنف ہفوات نے درج کی ہے اس سے حضرت عائشہؓ کی ہرگز ہتک ثابت نہیں ہوتی بلکہ آپکی رفعت ثابت ہوتی ہے۔ ہاں مصنف ہفوات نے اپنے ترجمہ میں ہتک کا مضمون پیدا کرنے کی کوشش بے شک کی ہے

وہ لکھتے ہیں کہ جب حضرت عائشہ رضہ نے چادر تطہیر میں داخل ہونا چاہا تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غصہ کے لہجہ میں فرمایا چل دور ہو تو اپنے درجہ پر ٹھیک ہے۔ یہ ترجمہ خواہ ان کا ہے یا قول مستحسن والیکا جس کے حوالہ سے انہوں نے یہ روایت نقل کی ہے بالکل غلط ہے۔ انہوں نے خود ہی الفاظ حدیث درج کئے ہیں جو یہ ہیں۔ قال تنحی فانکِ خیر۔ ان الفاظ میں 'غصہ سے کہا' کے الفاظ ہرگز موجود نہیں ہیں۔ اور نہ 'چل دور ہو' کے ہیں اور نہ یہ کہ 'تو اپنی جگہ ٹھیک ہے'۔ یہ تینوں باتیں اپنے پاس سے بنا کر داخل کردیگئی ہیں۔ الفاظ حدیث کا ترجمہ یہ ہے کہ ایک طرف ہو جاؤ تم بہت ہی اچھی ہو جس کے اگر کوئی معنے نکل سکتے ہیں تو صرف یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضہ سے فرمایا کہ تم میں تو پہلے سے ہی خیر موجود ہے تمہیں چادر تطہیر میں داخل ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ مگر حق یہ ہے کہ خواہ الفاظ کچھ ہوں یہ احادیث بعض نام نہاد محبان اہل بیت نے حقیقی اہل بیت کو بدنام کرنے کے لئے وضع کی ہیں۔

اسجگہ کسی کو شاید یہ شبہ گزرے کہ اس بیان سے تو معلوم ہوا کہ بعض احادیث جھوٹی بھی ہوتی ہیں پھر اعتبار کیا رہا؟ مگر یاد رہے کہ اس شبہ کا ازالہ میں پہلے کر آیا ہوں کہ باوجود بعض احادیث کے غلط ہونے کے حدیثوں پر اس حد تک اعتبار کیا جا سکتا ہے جس حد تک وہ اپنی ضرورت کو پورا کر رہی ہیں۔ اس سے زیادہ نہ ان پر اعتبار کیا جا سکتا ہے اور نہ انکی ضرورت ہے۔ اسلام کے اصول قرآن کریم اور سنت سے ثابت ہیں اور احادیث صرف سنت کی مؤید اور اسپر ایک تائیدی گواہ کے طور پر ہوتی ہیں۔ دوسرے امور کے متعلق وہ بحیثیت ایک معتبر تاریخ کے شاہد ہوتی ہیں۔ اور جس طرح معتبر سے معتبر تاریخ میں غلطیاں پائی جاتی ہیں لیکن اسکے فائدہ سے انکار نہیں ہو سکتا اسی طرح ان میں بھی غلطیاں پائی جاتی ہیں اور ان کے فائدہ سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ حدیث میں یہ خوبی ہے کہ اسکے جمع کرنے میں جو احتیاط برتی گئی ہے اسکے سبب سے یہ یورپ کی تاریخوں کا تو ذکر ہی کیا ہے اسلامی زمانہ کی مدون شدہ تاریخوں سے بھی بعض حیثیتوں میں زیادہ معتبر ہے اور اس میں جھوٹ کا معلوم کر لینا آسان ہے۔

اگر کہا جائے کہ پھر مصنف ہفوات ہیں اور ہم ہیں اختلاف کیا ہے۔ انہوں نے بھی بعض احادیث کو ہی جھوٹا قرار دیا ہے اور ہمنے بھی تسلیم کر لیا ہے کہ بعض احادیث جھوٹی ہو سکتی ہیں بلکہ جھوٹی ہیں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہم میں اور مصنف ہفوات میں بہت سے فرق ہیں۔ اوّل یہ کہ انہوں سلنے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ بعض احادیث کے غلط ہونے سے کتب احادیث کا ہی اعتبار اُٹھ جاتا ہے اور یہ بات جیسا کہ میں ثابت کر چکا ہوں بالبداہت باطل ہے۔ دوم یہ کہ انہوں نے بعض احادیث پر اعتراض کر کے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ان کتب کے مصنفین جن میں وہ احادیث پائی جاتی ہیں جھوٹے اور فریبی اور دشمن اسلام تھے اور ان کی کتب کا اعتبار کر کے وہ دوسرے مسلمان بھی ان کے ہم نوا ہیں۔ لیکن جیسا کہ میں ثابت کر چکا ہوں یہ بات غلط ہے۔ بہت سی حدیثیں جنکو ہم غلط سمجھتے ہیں ان کو غلط سمجھتے ہوئے ہی محدثین نے اپنی کتب میں درج کیا ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ ان کی کتب میں اضداد مطالب کی احادیث ایک ہی جگہ جمع نظر آتی ہیں۔ انہوں نے تحقیق کا ایک معیار مقرر کیا ہے اور اس معیار کے مطابق جو حدیث ان کو ملی ہے خواہ بعض دوسرے طریقوں سے اسکی کمزوری ہی ثابت ہوتی ہو انہوں نے اسکو اپنی کتاب میں لکھدیا ہے اور یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا باستثناء ایک دو کتب احادیث کے کہ ہر ایک حدیث جو کسی محدث کی کتاب میں پائی جاتی ہے اس کا مؤلف اسے ضرور صحیح ہی تسلیم کرتا تھا۔ وہ صرف یہ خیال کرتا تھا کہ میرے مقرر کردہ معیار کے چونکہ یہ حدیث مطابق آتی ہے مجھپر دیانتداری سے اس کا لکھدینا فرض ہے اور بس۔ پس باوجود بعض کمزور یا وضعی احادیث کے پائے جانے کے کتب احادیث کے اکثر مصنفین کے درجہ اور اتقاء میں فرق نہیں آتا۔ ان میں سے بعض اپنے اپنے زمانہ کے لئے رکن اسلام تھے اور اولیاء اللہ میں تھے اور ان کو گالیاں دینے والا نعوذ تقویٰ اور طہارت سے بے بہرہ ہے۔ اور اگر فرض بھی کر لیا جائے کہ بعض احادیث انہوں نے صحیح سمجھکر لکھیں۔ لیکن وہ صحیح نہ تھیں۔ اور بعض احادیث کے متعلق یہ سمجھ لینا بالکل قرین قیاس ہے بلکہ قیاس کا غالب پہلو اسی طرف ہے تو بھی چند ایک غلطیوں سے بشرطیکہ وہ غلطیاں سہو و خطاء کی حد میں ہوں اور شرارت کا نتیجہ

نہ ہوں ایک شخص کے نہایت مفید کام اور عمر بھر کی قربانی کی تحقیر نہیں کیجا سکتی۔

سوم یہ فرق ہے کہ مصنف ہفوات کی غرض یہ نہیں ہے کہ بعض غلط اور کمزور احادیث کی طرف مسلمانوں کو توجہ دلائیں۔ بلکہ ان کی غرض اس پردہ میں ائمہ اسلام اور اہل بیت میں سے پہلے مخاطبین کی ہتک کرنا ہے اور وہ صحیح احادیث کو جان بوجھکر اپنے اصلی مطلب سے پھرا کر دوسرا رنگ چڑھا کر پیش کرتے ہیں تا اہل سنت والجماعت پر بزعم خود پھبتی اڑائیں اور ان کی تضحیک کریں اور ان کی غرض کسی غلطی کی اصلاح نہیں ہے بلکہ نئی غلطیاں پیدا کر کے ان کی الجھن میں لوگوں کو پھنسانا ہے۔ چنانچہ اکثر احادیث سے جو انہوں نے منتخب کی ہیں بالکل صاف اور واضح طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ صرف بغض اور تعصب کی وجہ سے انہوں نے ان کو اپنے اصل مطلب سے پھیر کر ائمہ حدیث اور ازواج مطہرات اور صحابہ کرام کو گالیاں دینے کا ایک ذریعہ پیدا کیا ہے۔

چہارم یہ فرق ہے کہ ان کا خیال ہے کہ صرف کتب اہل سنت میں اس قسم کی غلط روایات داخل ہو گئی ہیں حالانکہ شیعہ کتب بھی اس قسم کی احادیث سے بھری پڑی ہیں بلکہ اہل سنت کی کتب سے بہت زیادہ کمزور اور وضعی احادیث ان میں موجود پائی جاتی ہیں۔

غرض باوجود بعض احادیث کو غلط ماننے کے ہمارے اور مصنف ہفوات کے خیالات ایک نہیں بلکہ دونوں خیالات میں بعد المشرقین ہے اور ایک خیال اسلام کو اس کی اصل شکل میں دنیا کے سامنے لاتا ہے تو دوسرا اسکو دشمنان اسلام کی نظروں میں نہایت مکروہ اور بھیانک کر کے دکھاتا ہے۔

بہتان اقدام زنا و طلبی [illegible]

مصنف ہفوات نے ایک الزام ائمہ حدیث پر یہ لگایا ہے کہ انہوں نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر ایک حسین عورت کے طلب کرنے کا الزام لگایا ہے اور اس کے بعد ایک اور الزام یہ نقل کیا ہے کہ انہوں نے نعوذ باللہ من ذلک رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اقدام زنا کا بھی الزام لگایا ہے۔ اور پہلی بات کی تصدیق کے لئے بخاری کی ایک حدیث

جس کے راوی سہل بن سعد ہیں اور جو کتاب الاشربہ کے باب الشرب من قدح النبی صلے اللہ علیہ وسلم میں درج ہے۔ لکھی ہے اور دوسرے الزام کی تصدیق کے لئے بخاری کی ایک اور روایت جو ابو سعید سے مروی ہے اور کتاب الطلاق میں درج ہے بیان کی ہے۔

گو مصنف ہفوات نے یہ اعتراض الگ الگ ہیڈنگوں کے نیچے اور الگ روایتوں کی سند سے لکھے ہیں۔ لیکن میں انکا جواب اکٹھا ہی دینا چاہتا ہوں۔ کیونکہ ان کو الگ الگ اعتراض مصنف ہفوات کی بوالہوسی نے بنا دیا ہے ورنہ یہ دونوں اعتراض ایک ہی ہیں۔ اور یہ دونوں روایتیں ایک ہی واقعہ کی طرف اشارہ کر رہی ہیں اور ان کو الگ الگ واقعات سمجھنا یا تو مصنف ہفوات کے بڑہے ہوئے بغض پر دلالت کرتا ہے جسکی وجہ سے وہ کسی بات کے سمجھنے سے بالکل معذور ہو گئے ہیں اور یا اسپر شاہد ہے کہ وہ علم حدیث سے بالکل کورے ہیں اور صرف کتابیں کھولکر نقل کر دینے کی عادت رکھتے ہیں اور اس نقل میں بھی عقل سے کام نہیں لے سکتے۔ جن لوگوں نے کوئی ایک کتاب بھی حدیث کی پڑہی ہے وہ جانتے ہیں کہ ایک واقعہ کو کئی کئی آدمیوں نے بیان کیا ہے اور ان مختلف لوگوں کی روائت کی وجہ سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ واقعہ دو ہیں۔ اگر ایک واقعہ کو سو آدمی دیکھکر اپنے اپنے دوستوں کے سامنے بیان کریں تو وہ سو واقعات نہیں ہو جاتے۔ جیسا کہ ظاہر ہے۔ ان دو حدیثوں میں ایک ہی واقعہ دو راویوں کی زبانی سے بیان ہے۔ اور جیسا کہ میں آگے ثابت کرونگا یہ ایسی ثابت شدہ بات تھی کہ مصنف صاحب ہفوات اگر علم حدیث سے محض نابلد اور جاہل آدمی نہیں ہیں تو ان کو اس کا علم ہونا چاہیئے تھا۔ اور اگر ان کو اس کا علم تھا تو اس صورت میں صرف یہی سمجھا جا سکتا ہے کہ اعتراضوں کی تعداد بڑہانے کے لئے انہوں نے ایک واقعہ کو دو بنا دیا ہے۔

جن حدیثوں پر مصنف ہفوات نے اعتراض کیا ہے اور جو اعتراض ان پر کئے ہیں ان کو بیان کرکے میں بتاتا ہوں کہ انہوں نے کس جہالت یا دھوکا دہی کا ثبوت دیا ہے۔ پہلی حدیث وہ یہ لکھتے ہیں۔ عن سھل بن سعد قال ذکر النبی صلعم امرأۃ من العرب فامر ابا سعید الساعدی ان یرسل الیھا فارسل فقدمت فنزلت فی اجم بنی ساعدۃ فخرج النبی صلعم حتی جاءھا فدخل علیھا۔ الخ میں

مضمون کو سمجھانے کے لئے جو حصہ حدیث کا مصنف ہفوات نے چھوڑ دیا ہے اس کو بھی لکھ دیتا ہوں۔ آگے لکھا ہے فاذا امرءۃ منکسۃ رأسھا فلما کلمھا النبی صلعم قالت اعوذ باللہ منک فقال قد اعذتک منی فقالوا لھا اتدرین من ھذا قالت لا قالوا ھذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جاء لیخطبک قالت کنت انا اشقی من ذلک۔ کتاب الاشربہ۔ ترجمہ۔ سہل بن سعد بیان کرتے ہیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس عرب کی ایک عورت کا ذکر کیا گیا پس آپنے ابو سعید الساعدی کو حکم فرمایا کہ اسکو بلوا بھیجے۔ انہوں نے بلوا بھیجا۔ جب وہ آئی تو بنو ساعدہ کے قلعے میں اتری اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اس کی طرف تشریف لیگئے۔ جب وہاں پہونچے اور اسکے پاس گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک عورت سر جھکائے بیٹھی ہے۔ جب آپنے اس سے کلام کیا تو اسنے کہا کہ میں تجھ سے اللہ کی پناہ مانگتی ہوں۔ آپنے فرمایا میں نے تجھے اپنے سے پناہ دی۔ اسپر لوگوں نے اس سے کہا کیا تو جانتی ہے یہ شخص کون تھا؟ اسنے کہا نہیں انہوں نے کہا یہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم تھے جو تجھ سے نکاح کی درخواست کرنے آئے تھے۔ اسنے کہا میرے جیسی بدبخت آپکے لائق کہاں ؟

کیا کوئی شخص ساری حدیث کو پڑھکر کہہ سکتا ہے کہ اس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر کوئی الزام لگایا گیا ہے۔ اگر اس حدیث سے کوئی استدلال کیا جا سکتا ہے تو صرف یہ کہ آپ ایک عورت کے پاس گئے اور اسے نکاح کا پیغام دیا۔ لیکن اس بدبخت نے کسی کے سکھانے سے یا اپنے نفس کی شرارت سے نہ صرف نکاح سے انکار کیا بلکہ نہایت برے لفظوں میں انکار کیا اور اسپر آپ بلا کچھ کہے واپس تشریف لے آئے کیونکہ شرعاً عورت کا حق ہے کہ وہ اپنی رضامندی سے نکاح کرے کوئی اسے کسی خاص جگہ نکاح کرنے پر مجبور نہیں کر سکتا (میں آگے چل کر بتاؤں گا کہ فی الواقع یہ استدلال بھی درست نہیں کیونکہ اس عورت سے آپکی شادی ہو چکی تھی) اور پھر اگر اس حدیث سے کچھ معلوم ہوتا ہے تو یہ ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا معاملہ بادشاہوں سے بالکل مختلف تھا۔ ان کی خواہش کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالے

کے احکام کی پیروی میں اس امر کی بالکل پرواہ نہیں فرماتے تھے کہ کوئی شخص آپکی نسبت ہتک آمیز الفاظ کہدے۔

یہ ٹکڑہ حدیث کا کس طرح وضاحت سے بتا دیتا ہے کہ مصنف ہفوات کی نیت نیک نہیں بلکہ بد ہے کیونکہ وہ اتنا تو بیان کر دیتا ہے کہ ایک عورت کا ذکر کیا گیا اور آپنے اسکو بلوایا اور اسکے پاس تشریف لیگئے لیکن اس کا اگلا حصہ جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ آپ ایک جماعت سمیت اسکے پاس گئے تھے اور یہ کہ آپ اسکو نکاح کا پیغام دینے گئے تھے اسکو اس نے بالکل چھوڑ دیا تاکہ یہ سمجھا جائے کہ حدیث کا یہ مطلب ہے کہ آپ کسی بدنیتی سے گئے تھے بلکہ اس قدر دلیری سے کام لیا ہے کہ اس اعتراض کو الفاظ میں بھی بیان کر دیا ہے۔ یورپ کے لوگ بھی اسلام پر اعتراض کرتے ہیں۔ مگر میں نے ایسی بے حیائی ان کی طرف سے بھی نہیں دیکھی کہ اس قدر صریح امر کو آدھا بیان کر کے انہوں نے اسپر اعتراض جمائے ہوں۔ شائد یہ مصرع کہ "چہ دلاورست دزدے کہ بکف چراغ دارد" مصنف ہفوات کی قسم کے لوگوں کو ہی مدنظر رکھکر کہا گیا ہے۔

گویہ حدیث ہی مصنف ہفوات کے اعتراض کو رد کر دیتی ہے اور اسی وجہ سے انہوں نے پچھلے حصہ کو اڑا دیا ہے تاکہ ان کے اعتراض کا پول نہ کھل جائے۔ لیکن میں ابھی اور دلائل سے ثابت کرونگا کہ مصنف ہفوات نے جان بوجھکر اس واقعہ کو بگاڑ کر پیش کیا ہے اور ائمہ حدیث پر ہاتھ صاف کرنے کے لئے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی عزت اور احترام کا بھی پاس نہیں کیا۔

دوسری حدیث جس کو مصنف ہفوات نے الگ واقعہ کے طور پر پیش کیا ہے اور جو درحقیقت اسی واقعہ کیطرف اشارہ کرتی ہے۔ یہ ہے۔ عن ابی اسید رضہ قال خرجنا مع النبی صلے اللہ علیہ وسلم حتیٰ انطلقنا الی حائطٍ یقال لہ الشوط حتیٰ انتہینا الی حائطین فجلسنا بینہما فقال النبی صلے اللہ علیہ وسلم اجلسوا ھہنا ودخل وقد اوتی بالجونیۃ فانزلت فی بیت فی نخلٍ فی بیت اُمیمۃ بنت النعمان بن شراحیل ومعہا دایتہا حاضنۃ لہا فلمّا دخل علیہا النبی صلی اللہ علیہ وسلم

قال ھبی نفسك لی قالت وھل تھب الملکۃ نفسھا للسوقۃ قال فاھوٰی بیدہ یضع یدہ علیھا لتسکن فقالت اعوذ باللہ منك فقال قد عذت بمعاذ ثم خرج علینا فقال یا ابا اسید اکسھا رازقیتین والحقھا باھلھا۔ بخاری کتاب الطلاق۔ (ترجمہ) ابو اسید رضی اللہ عنہ سے روائیت ہے انہوں نے فرمایا کہ ہم ایک دن رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلے اور ایک باغ کا رخ کیا جسے شوط کہتے ہیں۔ جب ہم دو باغوں کے درمیان پہنچے تو ان کے درمیان میں بیٹھ گئے آپنے فرمایا یہاں بیٹھے رہو اور آپ باغ کے اندر داخل ہوئے اور اسجگہ جونیہ پہلے سے ایک گھر میں جو کھجوروں کے درختوں میں تھا لاکر رکھی گئی تھی آپ داخل ہوئے امیمہ بنت نعمان بنت شراحیل کے گھر میں (یہ جونیہ کا ہی نام ہے جونیہ اسکے قبیلہ کی نسبت کی وجہ سے اسکو کہا جاتا تھا) اور اسکے ساتھ اس کی دایہ یعنی کھلائی تھی پس جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے کہا کہ اپنے نفس کو مجھے ہبہ کردے تو اسنے جواب دیا کیا ملکہ اپنے آپ کو عام آدمیوں کے سپرد کرتی ہے۔ ابو اسید رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ اسپر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسکی طرف ہاتھ بڑھایا تا اسپر اپنا ہاتھ رکھیں اور اسکا دل تسکین پائے۔ اسپر اسنے کہا میں تجھ سے اللہ کی پناہ مانگتی ہوں۔ اس بات کو سنکر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تو نے اس کی پناہ مانگی ہے جو بڑا پناہ دینے والا ہے۔ پھر آپ باہر ہمارے پاس تشریف لائے اور فرمایا اے ابا اسید اسکو دو چادریں دیدو اور اسکے گھر والوں کے پاس اسے پہنچادو۔

اس حدیث کو نقل کرکے مصنف ہفوات نے یہ اعتراض کئے ہیں۔ (۱) اس حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اقدام زنا کا الزام لگایا گیا ہے (۲) زن اجنبیہ پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ بڑھایا (۳) محصنہ اجنبیہ (یعنی اجنبی بن بیاہی عورت) نے دہائی دیکر اپنا پیچھا چھوڑایا۔

مگر ان اعتراضات پر ہی آپکی تسلی نہیں ہوئی ایک آریہ رام سنگھ بی اے کی زبانی ایک لمبا طومار اعتراضات کا اس حدیث پر لکھ مارا ہے یعنی (۱) ایک عورت کو

بستی سے الگ آبادی سے دور باغ میں بلوایا گیا (۲) اسکو بلا پیسے ٹکے قبضہ میں لانا چاہا (۳) اسکو یہ بھی نہیں بتایا گیا کہ آپ ہیں کون (۴) جب اس عورت نے انکار کیا تو اس کی طرف زبردستی کرنے کے لئے ہاتھ بڑھایا گیا (۵) پھر اس بے حجابانہ ملاقات کے صلہ میں اس عورت کو بیت المال میں سے معاوضہ دیا گیا۔

آریہ بیچارہ کا تو نام پردہ ڈالنے کیلئے لیا گیا ہے درحقیقت یہ اعتراضات بھی خود مصنف ہفوات کی طرف سے ہی ہیں۔ مجھے تعجب آتا ہے کہ اس عقل و دانش اور علم و فہم پر آپکو کتاب لکھنے اور پھر ائمہ اسلام کے منہ آنے کی کیا سوجھی تھی۔ اس حدیث میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں جس سے ظاہر ہو کہ جونیہ کو شہر سے باہر ویرانہ میں بلایا گیا تھا یا یہ کہ وہ زن اجنبیہ تھی یا یہ کہ اس سے زبردستی کی گئی یا یہ کہ اسے بیت المال سے روپیہ دیا گیا تھا۔ بلکہ اسکے برخلاف الفاظ حدیث سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ آباد جگہ بلکہ چوراہے پر اتاری گئی تھی۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم ایک جماعت مسلمین سمیت اسکے گھر تشریف لیگئے تھے۔ خود اسکے ساتھ بھی ایک دایہ تھی۔ آپنے اسکے ساتھ کوئی زبردستی نہیں کی بلکہ حدیث کے لفظ صاف ہیں کہ اسکی تسلی کیلئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسپر ہاتھ رکھنا چاہا۔ کیا زبردستی ہاتھ ڈالنے سے دوسرے انسان کی تسلی ہوا کرتی ہے؟ اس حدیث سے یہ بھی معلوم نہیں ہوتا ہے کہ اسکو معلوم نہ تھا کہ آپ کون ہیں کیونکہ اس حدیث میں اس قسم کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اسی طرح بیت المال سے اسکو کسی رقم کے دیئے جانیکا کوئی ذکر نہیں۔ ایک صحابی کو کہا گیا ہے کہ وہ اسکو دو کپڑے دیدے اور اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ بیت المال سے دیدے بلکہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ اپنی طرف سے کپڑے دینے کو کہا گیا ہے۔ خواہ یہ سمجھ لیا جائے کہ اس صحابی کے پاس آپکا کچھ مال ہوگا خواہ یہ کہ اس سے آپنے قرض لیکر یہ کپڑے دلوائے تاریخ اس امر پر شاہد ہے کہ آپ بیت المال مسلمانان سے کوئی رقم اپنے ذاتی اخراجات کیلئے نہیں لیتے تھے پھر اس ثابت شدہ حقیقت کے خلاف کوئی نتیجہ کس طرح نکالا جا سکتا ہے؟

مصنف ہفوات کا بغض اس قدر بڑھا ہوا ہے کہ اس حدیث کے اس حصہ کا ترجمہ جس میں جونیہ پر ہاتھ رکھنے کا ذکر ہے اسنے یوں کیا ہے "پس آنحضرت نے اوس کی طرف ہاتھ بڑھایا (یعنے زبردستی کرنی چاہی) تاکہ اسے تسکین ہو" صفحہ ۸۔ اس ترجمہ کو دیکھکر ہی ہر عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ مصنف ہفوات اس کتاب کی تصنیف کے وقت جوش تعصب سے اندھے ہو رہے تھے۔ کیونکہ ایک طرف تو آپ حدیث کے لفظوں کا یہ ترجمہ کرتے ہیں کہ ہاتھ بڑھایا تا اس عورت کو تسکین ہو۔ اور دوسری طرف خطوط وحدانی میں نوٹ کرتے ہیں "یعنے زبردستی کرنی چاہی" اور یہ جملہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ فلاں شخص کو اسنے مارنا چاہا تا اسکے دل سے ڈر نکل جائے۔ فلاں شخص کو اسنے زہر دیا تا وہ بچ جائے۔ اگر آپنے اس عورت کی تسکین کے لئے ہاتھ بڑھایا تھا تو اس سے زبردستی کرنیکا مفہوم کیونکر نکل آیا؟

غرض حدیث کے الفاظ اس مفہوم کو بصراحت رد کر رہے ہیں جو مصنف ہفوات نے حدیث سے اخذ کیا ہے لیکن اس سے بھی زیادہ صراحت اس حدیث کے سیاق وسباق سے ہو جاتی ہے اور کم سے کم ائمہ حدیث ہر ایک اعتراض سے محفوظ ہو جاتے ہیں

اس حدیث کا جو مفہوم امام بخاری نے سمجھا ہے اور اس عورت کا جو تعلق انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے خیال کیا ہے وہ اس سے ظاہر ہے کہ یہ حدیث انہوں نے اس مسئلہ کے ثبوت میں تحریر کی ہے کہ کیا طلاق دینی اور خصوصاً عورت کے منہ پر طلاق دینی درست ہے چنانچہ وہ اس حدیث کو اس باب میں بیان کرتے ہیں "باب من طلّق وھل یواجہہ الرجل امرأتہ بالطلاق" یہ عنوان ظاہر کرتا ہے کہ امام بخاری جونیہ کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی منکوحہ بیوی خیال کرتے ہیں اور آپکے اس قول کو کہ "تو نے اس کی پناہ مانگی ہے جو پناہ دینے والا ہے" طلاق قرار دیکر یہ نتیجہ نکال لیتے ہیں کہ ضرورت کے وقت طلاق عورت کے منہ پر بھی دیجا سکتی ہے اور یہ بد اخلاقی نہیں کہلائیگی۔ اگر جونیہ امام بخاری کے نزدیک زن اجنبیہ تھی اور اگر اسکا انکار حفاظت عصمت کیلئے تھا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا

واپس آجانا فضیحت کے خوف سے تھا (نعوذ باللہ من ذٰلک) تو اس سے یہ کیونکہ ثابت ہو گیا کہ عورت کو اسکے منہ پہ طلاق[1] دی جا سکتی ہے پس باوجود اس کے کہ امام بخاری اس حدیث سے یہی نتیجہ نکالتے ہیں کہ جونیہ آپکی منکوحہ بیوی تھی اور اسکے گستاخی آمیز کلام کی وجہ سے آپنے اسکو طلاق دیدی تھی یہ نتیجہ نکالنا کہ محدثین نے آپ پر اقدام زنا کی تہمت لگائی ہے کہانتک درست ہے۔ کیا مصنف ہفوات کے نزدیک ایک خاوند کا اپنی بیوی کے پاس جانا زنا ہے اور کیا اسی معیار پر وہ اپنی اور اپنے آبا کی نسل کو پرکھا کرتے ہیں؟

یہ تو اس حدیث کا سیاق ہے۔ سباق بھی اس سے کم واضح نہیں۔ اس حدیث کے بعد جو مصنف ہفوات نے بیان کی ہے۔ دوسری حدیث جو اسی راوی کی بیان کردہ ہے جس نے پہلی روایت بیان کی ہے یہ ہے۔ عن سھل بن سعد وابی اسید قالا تزوج النبی صلے اللہ علیہ وسلم امیمۃ بنت شراحیل فلما ادخلت علیہ بسط

[1] ہفوات کے نئے ایڈیشن میں مولوی ثناء اللہ صاحب کے جواب کا ذکر کرتے ہوئے جو انہوں نے اس اعتراض کے متعلق اپنے اخبار میں شائع کیا ہے مصنف صاحب ہفوات لکھتے ہیں کہ باب الطلاق کے نیچے اس حدیث کا درج کرنا اس امر پر دلالت نہیں کرتا کہ امام بخاری کی مراد یہ ہے کہ جونیہ کا رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے نکاح ہو چکا تھا کیونکہ امام بخاری باب و حدیث کی مطابقت کی پابندی نہیں کیا کرتے اول تو ان کا یہ دعویٰ باطل ہے۔ امام بخاری پابندی کرتے ہیں مگر انہوں نے کتاب سمجھداروں کے لئے لکھی ہے جہال کیلئے نہیں لکھی اسلئے بعض جہلا کو جو حقیقت شناسی کی قابلیت نہیں رکھتے باب و حدیث میں موافقت نظر نہیں آتی۔ لیکن اگر یہ کوئی اعتراض ہے تو امام بخاری ہی اسکا نشانہ نہیں ہیں شیعوں کی سب سے معتبر کتاب کافی بھی اس سے مستثنا نہیں ہے چنانچہ فروع کافی جلد اول میں صلوٰۃ فاطمہ کا باب باندھکر نیچے جو احادیث لکھی ہیں ان میں حضرت فاطمہ کی نماز کا کوئی ذکر ہی نہیں پس اس اصل کے ماتحت کہ اگر بعض بابوں کا احادیث سے جہلاء کو تعلق نظر نہ آئے تو اس کے یہ معنے ہیں کہ باب سے حدیث کے مفہوم کا استدلال درست نہیں تمام کافی غیر معتبر ٹھہرے گی۔

یدہ الیہا فکانہا کرھت ذلک فامر ابا اسید ان یجھزھا ویکسوھا ثوبین رازقیین۔ ترجمہ۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے امیمہ بنت شراحیل سے نکاح کیا جب وہ آپکے پاس لائی گئی اور آپنے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اسنے ایسا ظاہر کیا گویا وہ اسکو ناپسند کرتی ہے۔ پس آپنے ابا اسید کو حکم دیا ہے کہ اسے واپس اسکے وطن پہنچا دے اور دو رازقی چادریں اسکو دیدے۔ یہ حدیث جیسا کہ اوپر آچکا ہے انہی ابو اسید کی بیان کردہ ہے جنہوں نے پہلی حدیث بیان کی ہے اور یہی ہیں جنکو کپڑے دینے کا حکم ملا ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ وہ عورت رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی منکوحہ تھی۔

اس سیاق وسباق کی موجودگی میں مصنف ہفوات کا جونیہ کو ایک اجنبی عورت قرار دیکر اور ایک سرتاپا جھوٹا قصہ بنا کر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات پر گندے سے گندے اعتراضات کرنا خواہ وہ اعتراضات بظاہر ائمہ حدیث کا نام لیکر ہی کیوں نہ کئے جائیں۔ اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ ان کو اسلام اور بانی اسلام سے محبت نہیں بلکہ عداوت ہے اور یہ امر ثابت ہو جاتا ہے کہ انہوں نے جان بوجھکر حقیقت کو چھپایا ہے نہ کہ نادانی سے واقعات کو نظر انداز کیا ہے۔

میرے نزدیک مصنف ہفوات کے اعتراض کی حقیقت پوری طرح تب بے نقاب ہوگی جب میں جونیہ کا تمام واقعہ تاریخ سے بیان کردوں۔ طبری۔ ابن سعد اور ابن حجر جیسے زبردست مؤرخین کی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ اسماء یا امیمہ اسکے نام میں اختلاف ہے (مگر میرے نزدیک ہو سکتا ہے کہ اسکے دو نام ہوں۔ ایسا بہت دفعہ ہوتا ہے کہ ایک شخص کے دو نام ہوتے ہیں یا تو مختلف رشتہ دار مختلف نام رکھ دیتے ہیں یا بعض لوگ خود ہی بڑی عمر میں اپنے لئے ایک اور نام پسند کر لیتے ہیں اور لوگوں میں وہ ان مختلف ناموں کی وجہ سے مشہور ہو جاتے ہیں) کندہ قبیلہ سے تھی اور اس نسبت سے کندیہ کہلاتی تھی۔ اسکے والد کا نام اسود ابوالجون تھا۔ اس وجہ سے وہ جونیہ یا بنت الجون کہلاتی تھی۔ بعض روایات میں اسکو اسود کی پوتی اور نعمان کی بیٹی لکھا ہے۔ لیکن یہ اختلاف بے حقیقت اور دراصل مطالب سے بے تعلق ہے۔ جب عرب فتح ہوا اور اسلام پھیلنے لگا

تو اس کا بھائی نعمان یا بموجب بعض روایات کے اس کا والد نعمان رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنی قوم کی طرف سے بطور وفد کے حاضر ہوا اور اس موقع پر اس نے یہ بھی خواہش ظاہر کی کہ اپنی ہمشیرہ کی شادی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کر دے اور بالمشافہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست بھی کر دی کہ میری ہمشیرہ جو پہلے اپنے ایک رشتہ دار سے بیاہی ہوئی تھی اور اب بیوہ ہے نہائت خوبصورت اور لائق ہے آپ اس سے شادی کر لیں۔ چونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو قبائل عرب کا اتحاد منظور تھا آپ نے اس کی یہ درخواست منظور کر لی۔ اور فرمایا کہ ساڑھے بارہ اوقیہ چاندی پر نکاح پڑھ دیا جائے۔ اس نے کہا کہ یا رسول اللہ ہم معزز لوگ ہیں مہر تھوڑا ہے۔ آپ نے فرمایا اس سے زیادہ میں نے کسی اپنی بیوی یا لڑکی کا مہر نہیں باندھا۔ جب اس نے رضامندی کا اظہار کیا نکاح پڑھا گیا اور اس نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ کسی آدمی کو بھیجکر اپنی بیوی کو منگوا لیجئے۔ آپ نے ابا اسید رضہ کو اس کام پر مقرر کیا وہ تشریف لیگئے۔ جونیہ نے ان کو اپنے گھر میں بلایا تو آپ نے کہا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں پر حجاب نازل ہو چکا ہے۔ اس لئے اسپر دوسری ضروری ہدایات دریافت کیں۔ آپ نے بتادیں اور اونٹ پر بٹھا کر مدینہ لائے اور ایک مکان میں جس کے گرد کھجوروں کے درخت بھی تھے لاکر اتارا۔ اسکے ساتھ اس کی دایہ بھی اسکے رشتہ داروں نے روانہ کی تھی جس طرح کہ ہمارے ملک میں ایک بے تکلف نوکر ساتھ کیجاتی ہے تا کسی قسم کی تکلیف نہو۔ چونکہ یہ عورت حسین مشہور تھی اور یوں بھی عورتوں کو دلہن کے دیکھنے کا شوق تھا مدینہ کی عورتیں اس کو دیکھنے گئیں اور اس عورت کے اپنے بیان کے مطابق کسی عورت نے اسکو سکھا دیا کہ رعب پہلے دن ہی ڈالا جاتا ہے۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تیرے پاس آئیں تو تو کہدیجیؤ کہ میں آپ سے اللہ کی پناہ مانگتی ہوں۔ اس پر وہ تیرے زیادہ گرویدہ ہو جائینگے۔ اگر یہ بات اس عورت کی بنائی ہوئی نہیں تو کچھ تعجب نہیں کہ کسی منافق نے اپنی بیوی یا اور کسی رشتہ دار کے ذریعہ یہ شرارت کی ہو۔ غرض جب اس کی آمد کی اطلاع رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو ملی

آپ اس گھر کو تشریف لیگئے جو اس کے لئے مقرر کیا گیا تھا۔ اور اس کو اپنے پاس بیٹھنے کے لئے کہا۔ اسنے اس پر کراہت کا اظہار کیا۔ آپنے اس خیال سے کہ یہ اجنبیت کی وجہ سے گھبرا رہی ہے تسکین اور تسلی دینے کیلئے اسپر ہاتھ رکھا جس پر اس نے وہ نامعقول فقرہ کہا کہ میں تجھ سے اللہ کی پنہ مانگتی ہوں۔ چونکہ نبی خدا کا نام سنکر ادب کی روح سے بھر جاتا ہے اور اس کی عظمت کا متوالا ہوتا ہے اسکے اس فقرہ پر آپنے اسے کہدیا کہ تو نے بڑے کا واسطہ دیا ہے۔ میں تیری درخواست کو قبول کرتا ہوں اور اسے طلاق دیکر رخصت کر دیا اور ابو اسید رضؓ کو پھر اس کام پر مقرر کر دیا کہ اسے اسکے گھر واپس کر آئیں۔ اور علاوہ مہر کے حصہ کے دو رازقی چادریں بھی اسکو دینے کا حکم دیا تاکہ قرآن کریم کا حکم ولا تنسو الفضل بینکم۔ بقرہ ع ۳۱ پورا ہو جو ایسی عورتوں کے متعلق ہے جن کو بلا صحبت طلاق دیدی جائے۔ جب آپنے اس کو رخصت کر دیا تو ابو اسیدؓ اسکو اسکے گھر پہنچا آئے۔ اسکے قبیلہ کے لوگوں پر یہ بات نہائت شاق گذری اور انہوں نے اس کو ملامت کی مگر وہ یہی جواب دیتی رہی کہ یہ میری بدبختی ہے اور بعض دفعہ اسنے یہ کہدیا کہ مجھے دھوکا دیا گیا مجھے کسی نے سکھا دیا تھا کہ تو اس طرح کہیو اس طرح رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا دل تیری طرف خاص طور سے مائل ہو جائیگا۔

یہ ہے اصل واقعہ جو تاریخوں اور احادیث میں مفصل موجود ہے۔ اس موجودگی میں مصنف ہفوات کا احادیث بخاری پر یہ اعتراض کرنا کہ ان میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر زنا کی تہمت لگائی گئی ہے۔ اور اس اعتراض کو زوردار بنانے کے لئے ایک آریہ صاحب کو بھی اپنی مدد کے لئے لانا مصنف ہفوات کے جن اندرونی جذبات پر دلالت کرتا ہے انکا اندازہ لگانا میں حق پسند لوگوں پر ہی چھوڑتا ہوں۔

مذکورہ بالا حوالجات سے ظاہر ہے کہ جو واقعہ احادیث میں مذکور ہے اس کی بنا پر نہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات پر کسی قسم کا اعتراض کیا جا سکتا ہے۔ اور نہ اسکے بیان کرنے پر محدثین پر کوئی حرف گیری کی جا سکتی ہے۔ بلکہ اس واقعہ سے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کی مندرجہ ذیل خوبیاں نمایاں طور پر ظاہر

ہوتی ہیں۔ (۱) اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپکو عربوں کی اصلاح کی خاطر ان کے جذبات کے خیال رکھنے کا خاص طور پر احساس تھا۔ (۲) اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے اخلاق ایسے اعلیٰ درجہ کے تھے کہ آپ اپنی بیویوں سے بھی جو تمام قوانین تمدن کے ماتحت خاوند کے زیر حکومت سمجھی جاتی ہیں ایسے رنگ میں کلام کرتے تھے جو نہائت مؤدب ہوتا تھا اور جسے سنکر انسان خیال کر سکتا ہے کہ گویا کسی نہائت قابل ادب وجود سے آپ کلام کر رہے تھے؛

(۳) اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو نکاح میں عورت کی رضامندی کا اس قدر خیال تھا کہ نکاح کے بعد اس خیال سے کہ شاید عورت کی رضامندی حاصل نہ کیگئی ہو آپنے جونیہ سے کہا کہ ھبی نفسك لی اپنا آپ میرے سونپ دے یعنی نکاح پر رضا ظاہر کرے۔

(۴) اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ نہائت اشتعال انگیز باتوں پر بھی خندہ پیشانی سے صبر کر جاتے تھے؛

(۵) اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خشیت اللہ آپکے دل میں اس قدر تھی کہ خدا تعالےٰ کا نام آنے پر آپ حتی المقدور اپنے حقوق کے چھوڑ دینے پر بھی تیار ہو جاتے تھے۔ (۶) اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ ان لوگوں سے بھی حسن سلوک کرنے سے دریغ نہیں کرتے تھے جو آپکے لئے ایذاء اور تکلیف کا موجب بنتے تھے؛

غرض بجائے اسکے کہ اس واقعہ سے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات پر کوئی ادنےٰ سے ادنےٰ اعتراض بھی پڑتا ہو۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ اخلاق حسنہ کا ایک بینظیر نمونہ تھے؛

پیشتر اسکے کہ میں اس اعتراض کا جواب ختم کروں میں ان استدلالات پر بھی روشنی ڈالنا پسند کرتا ہوں جو میرے اوپر کے بیان کے خلاف بخاری کی نقل کردہ احادیث سے دشمن کر سکتا ہے؛

کہا جاسکتا ہے کہ حدیث میں جو یہ لفظ ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے

پاس ایک عورت کا ذکر کیا گیا اور آپ نے اُسکو بلوایا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپکا اس سے نکاح نہیں ہوا تھا۔ مگر یہ اعتراض درست نہیں ہوسکتا اسلئے کہ اس عورت کے متعلق جبکہ تاریخ اور حدیث سے ثابت ہے کہ اسکے باپ یا بھائی نے خود اسکا ذکر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کیا ہے اور نکاح کی درخواست کی ہے اور مہر مقرر کیا ہے اور نکاح پڑھا گیا ہے بلکہ اس عورت کے واقعہ سے فقہاء یہ استدلال کرتے چلے آئے ہیں کہ عورت کے منہ پر اسے صرورتاً طلاق دینی جائز ہے۔ تو پھر ان الفاظ سے یہ کیونکر نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اسکا نکاح نہیں ہوا تھا۔ اس حدیث سے تو صرف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ چونکہ اس جگہ صرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کٹورے کا (اصل حدیث اس بارے میں ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کٹورے میں ایک صحابی نے ایک اپنے دوست کو پانی پلایا ہے) ذکر کرنا مقصود تھا نکاح کے ذکر کو مختصر کر دیا ہے۔ چنانچہ طلاق کے ذکر میں یہی راوی اس واقعہ کا بیان کرتے ہوئے بیان کرتا ہے۔ تزوج النبی صلی اللہ علیہ وسلم امیمۃ بنت شراحیل (بخاری باب الطلاق) یعنے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جونیہ عورت سے نکاح کیا تھا۔

• دوسرا استدلال یہ کیا جا سکتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو یہ لفظ استعمال فرمائے ہیں کہ اپنا نفس مجھے دے۔ تو ان سے معلوم ہوتا ہے کہ نکاح نہیں ہوا تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ الفاظ اس امر پر دلالت نہیں کرتے کہ نکاح نہیں ہوا تھا بلکہ اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے قومی شرف کو مدنظر رکھتے ہوئے اور اخلاق فاضلہ سے کام لیتے ہوئے یہ الفاظ اسے پاس بلانے کے لئے استعمال فرمائے ہیں اور اس قسم کے الفاظ ہیں جیسے ایک میزبان دسترخوان پر سے کسی چیز کے اُٹھا کر دینے کے لئے مہمان سے کہدے کہ فلاں چیز مجھے عنایت فرمایئے۔ اسکے یہ معنی ہرگز نہیں ہوں گے کہ وہ مہمان کی تھی اور اس سے میزبان سوال کرتا ہے۔ غرض اپنا آپ مجھے عطا کر کے صرف یہ معنی ہیں

کہ میرے قریب ہو کر بیٹھ نہ کہ درخواست نکاح؛

دوسرا جواب اس اعتراض کا یہ ہے کہ چونکہ جس وقت نکاح ہوا ہے اس وقت یہ عورت مدینہ میں موجود نہ تھی اسلئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خیال سے کہ عورت کی رضامندی حاصل کرنا نکاح کیلئے نہائیت ضروری ہے ایسا نہ ہو کہ بھائی نے اپنی عزت کے خیال سے بلا اجازت ہی نکاح پڑھوا دیا ہو اور یونہی کہدیا ہو کہ بہن راضی ہے۔ اس سے کہا کہ ھبی نفسلک لی یعنی اب اپنی مرضی کا اظہار کردے کہ تو میرے نکاح میں خوشی سے آئی ہے۔ اسنے اسپر چونکہ ناراضگی کا اظہار کیا آپنے اس کو اسکے گھر بھجوا دیا قرآن کریم میں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکاح کرنے والی عورتوں کے متعلق لفظ ہبہ استعمال ہوا ہے جیساکہ سورۃ احزاب میں ہے۔ وان امرأۃ مومنۃ وھبت نفسہا للنبی ان اراد النبی ان یستنکحہا۔ ع۔ یعنے وہ عورت بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے جائز ہے جسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نکاح میں لانا چاہیں اور وہ اپنے نفس کو اس امر کیلئے پیش کردے؛

مصنف ہفوات کی نقل کردہ احادیث سے یہ بھی استدلال کیا جاسکتا ہے کہ اس عورت کا یہ کہنا کہ میں تم سے اللہ کی پناہ مانگتی ہوں بتاتا ہے کہ اس کا نکاح نہیں ہوا تھا۔ یہ استدلال بھی غلط ہوگا۔ اسلئے کہ اس عورت نے جیساکہ خود ظاہر کیا ہے۔ یہ الفاظ اپنا رعب جمانے کے لئے کہے تھے اور اسنے خیال کیا تھا کہ اس طرح آپ کے دل میں میری محبت بڑھ جائیگی۔ پس ان سے یہ استدلال نہیں کیا جاسکتا کہ اس کا نکاح آپ سے نہیں ہوا تھا یا یہ کہ اسے معلوم نہ تھا ابواسید اس کو لائے۔ راستے میں وہ ان سے وہ طریق پوچھتی رہی جس کا اختیار کرنا رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی بیویوں کے لئے ضروری تھا۔ پھر کیونکر کہا جاسکتا ہے کہ وہ ناواقف تھی۔ پس اس فقرہ کا محرک صرف یہ خیال تھا کہ اس قسم کی بات کہنے سے اس کا درجہ بڑھ جائیگا؛

ایک یہ استدلال کیا جاسکتا ہے کہ اگر واقع میں اس کا نکاح ہو چکا تھا تو پھر

اسنے یہ کیوں کہا کہ میں ان کو نہیں جانتی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ طبعی جواب ہی جو ایسے موقعوں پر دیا جاتا ہے علی الخصوص عورتیں دیا کرتی ہیں۔ لوگوں کا یہ سوال کرنا کہ تو جانتی ہے کہ یہ کون تھا؟ یہ بھی اظہار غصہ کیلئے تھا جیسا کہ ناراضگی میں ایسا فقرہ کہا جاتا ہے کہ تجھے معلوم ہے میں کون ہوں؟ یا تجھے معلوم ہے یہ کون ہے؟ اور اس عورت کا جواب بھی غصہ اور نامرادی کے نتیجہ میں تھا کہ میں نہیں جانتی کہ یہ کون ہے یعنی میں نہیں پرواہ کرتی کہ یہ کون تھا چنانچہ حقارت کیلئے لوگ کہا کرتے ہیں کہ ہم نہیں جانتے کہ فلاں شخص کون ہے حالانکہ بچپن سے اس شخص کے ساتھ تعلق اور واقفیت ہوتی ہے۔

غرض یہ سب استدلال باطل ہیں۔ اور واقعات کے مقابل میں قیاسات کو رکھنا عقل و دانش کے بالکل برخلاف ہے۔ جبکہ اسی روائت کا راوی صاف الفاظ میں یہ بیان کرتا ہے کہ اُس عورت سے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی شادی ہوئی تھی اور جبکہ ابو اسید جو اس عورت کو لائے ہیں وہ بیان کرتے ہیں کہ اس عورت کی شادی ہو چکی تھی۔ اور جبکہ حضرت عائشہ رض فرماتی ہیں کہ اُس کی شادی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہو چکی تھی اور آپنے اُس کو طلاق دیدی۔ تو پھر بعض اشارات سے جن کے کئی معنے ہو سکتے ہیں یہ نتیجہ نکالنا کہ شادی نہیں ہوئی تھی۔ اور واقعات اور تفصیلات کو ترک کر دینا کسطرح جائز ہو سکتا ہے؟ اسی طرح جبکہ امام بخاری نے اس روائیت کے نتیجہ میں یہ نکالا ہے کہ عورت کو اسکے منہ پر طلاق دیجا سکتی ہے۔ اور جبکہ انہوں نے اسی روائیت سے پہلے اسی عورت کے متعلق حضرت عائشہؓ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ اس عورت کو رسول کریم نے بعد نکاح طلاق دیدی تھی۔ اور جبکہ انہوں نے اس روائیت کے بعد اسی راوی کی بابت یہ روایت نقل کی ہے کہ اُس عورت کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شادی کرنیکے بعد بلوایا تھا۔ یہ نتیجہ نکالنا کہ امام بخاری کا اس روایت کے نقل کرنے سے یہ منشاء تھا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اقدام زنا کا الزام لگایا جائے۔ کیسا صریح جھوٹ اور کھلا کھلا دھوکہ ہے۔

مینے اوپر بیان کیا تھا کہ یہ دونوں روایتیں جو مصنف ہفوات نے بیان کی ہیں

درحقیقت ایک ہی واقعہ کی طرف اشارہ کرتی ہیں میرے نزدیک اس امر کا ثابت کرنا بھی مصنف ہفوات کی اصلی نیت پرسے پردہ اٹھا دیتا ہے اسلئے میں اسکو ثابت کر دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں ؎

علاوہ اسکے کہ تمام دوسری روایات اس امر کو ثابت کرتی ہیں کہ یہ دونوں حدیثیں ایک ہی واقعہ کے متعلق ہیں۔ ان دونوں میں مندرجۂ ذیل باتوں کا اشتراک بھی اس امر کو روز روشن کی طرح ثابت کر دیتا ہے ؎

اوّل دونوں روایتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ عورت باہر سے لائی گئی تھی ؎

دوم۔ دونوں روایتوں میں ایک ہی مکان کا ذکر ہے جس میں وہ عورت اتاری گئی ؎

سوم۔ دونوں روایتوں میں یہ بتایا گیا ہے کہ ابو اسید کو اس عورت کو لانے اور لیجانے کا کام سپرد ہوا ؎

چہارم۔ دونوں روایتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس عورت کے پاس تشریف لیگئے اور اس سے تسکین دہ الفاظ میں کلام کیا۔ لیکن اسنے کہا کہ میں آپ سے خدا کی پناہ مانگتی ہوں ؎

پنجم دونوں روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپنے اسکے اس قول پر اسے علیحدہ کر دیا۔

کیا کوئی عقل تجویز کرسکتی ہے کہ یہ سب واقعات ایک ہی شخص سے دو دفعہ گزرے تھے اور کیا صرف اس وجہ سے کہ ایک حدیث میں اس عورت کا نام نہیں آیا۔ ان دونوں روایتوں کو دو واقعوں کے متعلق قرار دیا جاسکتا ہے۔ علاوہ ازیں تمام معتبر شراح اور مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ یہ دونوں حدیثیں ایک ہی امر کے متعلق ہیں۔ دیکھو قسطلانی و فتح الباری ؎

مگر میں سمجھتا ہوں کہ مصنف صاحب ہفوات کی تسلی نہ ہوگی جبتک شیعہ کتب سے ہی یہ ثابت نہ کیا جائے کہ جونیہ بیاہتا بیوی تھیں اور اس غرض کیلئے میں مصنف صاحب ہفوات کو شیعوں کی سب سے معتبر کتاب فروع کافی جلد دوم کا حوالہ دیتا ہوں اس کتاب کے صفحہ ۱۷۶ پر کتاب النکاح میں باب اخر منہ لکھکر حسن بصری سے

روایت کی ہے کہ جونبیہ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کیا تھا اور پھر امام ابو جعفر سے اس کی تصدیق نقل کی ہے بلکہ ان کی زبان سے یہ اعتراض کرایا ہے کہ اس کو اور ایک اور عورت کو حضرت ابو بکر رضؓ نے نکاح کی اجازت دیدی حالانکہ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجیت میں آجانے کی وجہ سے امہات المومنین میں شامل تھی۔ اب کیا یہ عجیب بات نہیں کہ ایک طرف تو جونیہ کو نکاح کی اجازت دینے پر حضرت ابو بکر رضؓ پر یہ اعتراض کیا جائے کہ آپنے ایک ام المؤمنین کو نکاح کی اجازت دیکر رسول کریم صلعم کی ہتک کی اور دوسری طرف یہ کہا جائے کہ بخاری نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات جونیہ سے بیان کرکے آپ پر اقدام زنا کا الزام لگایا ہے۔ اگر جونیہ بیاہتا بیوی نہ تھی تو بقول فروع کافی امام جعفر نے اسے نکاح ثانی کی اجازت دینے پر اعتراض کیوں کیا ہے اور اگر وہ بیاہتا تھی تو اس سے ملاقات کا ذکر اقدام زنا کا الزام کیونکر بن گیا۔ اب کیا امام جعفر کو نعوذ باللہ الزام دیں کہ انہوں نے حضرت ابو بکر رضؓ کو بدنام کرنے کے لئے ان پر ایک اتہام لگایا یا مصنف ہفوات کو بے دین قرار دیں کہ بخاری کی عداوت میں اسنے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت پر حملہ کیا۔

حلول خدا بصورت عائشہ رضؓ

ایک اعتراض مصنف ہفوات نے یہ کیا ہے کہ مصنف کتاب فردوس آسیہ لکھتے ہیں کہ قرآن کریم میں اولئك مبرؤن مما يقولون کے الفاظ آتے ہیں ان کے یہ معنی ہیں کہ صفوان اور عائشہ رضؓ اور صدیق بری ہیں اس سے جو منافق کہتے ہیں اور اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ فردوس آسیہ کے مصنف کے نزدیک حضرت عائشہ رضؓ پر نعوذ باللہ من ذلک کسی منافق نے حضرت ابو بکر رضؓ کے ساتھ ناجائز تعلق کا بھی الزام لگایا تھا۔

تعجب ہے کہ مصنف ہفوات نے دعویٰ تو یہ کیا تھا کہ احادیث میں جو ہتک رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی کیگئی ہے اسکو پیش کرینگے لیکن آگئے فردوس آسیہ پر اور وہ بھی اس کے اقوال اور خیالات پر جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس غرض ان کی صرف اعتراض کرنا اور

اہل سنت سے لوگوں کو بدظن کرنا ہے نہ کہ احادیث کی تحقیق و تدقیق۔
چونکہ میرا کام ان احادیث اور ائمۂ احادیث کے متعلق حقیقت کو ظاہر کرنا ہے جن پر مصنف ہفوات نے اعتراض کئے ہیں اسلئے فردوس آسیہ کے مصنف کی بریت کی کوشش کرنا میرے مقصد سے دور ہے۔ مگر ضمناً میں اس قدر کہدینا چاہتا ہوں کہ گو میں نہیں جانتا کہ مصنف فردوس آسیہ کس تقویٰ اور کس علم کا آدمی تھا۔ مگر اس کی مذکورہ بالا تحریر سے وہ نتیجہ نکالنا جو مصنف ہفوات نے نکالا ہے۔ درست نہیں۔
مصنف ہفوات کو معلوم ہونا چاہئے کہ دنیا میں ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں۔ جو اولاد کے افعال پر ماں باپ کے افعال کو قیاس کر لیا کرتے ہیں اور کسی بچہ کے بد فعل کو دیکھکر کہدیا کرتے ہیں کہ اسکے ماں باپ بھی ایسے ہی ہونگے۔ پس کیا تعجب ہے کہ بعض منافقوں نے جنکو حضرت ابوبکرؓ سے بلاوجہ بغض تھا اور جو ان کو اسلام کے لئے بمنزلہ ستون دیکھکر ان کی تباہی اور بربادی کی فکر میں لگے رہتے تھے۔ یہ بھی کہدیا ہو کہ جیسی بیٹی ثابت ہوئی ہے (نعوذ باللہ) ایسا ہی باپ ہوگا۔ یا کم سے کم مصنف آسیہ کو خیال پیدا ہوا ہو۔ پس اس صورت میں اس آیت میں حضرت ابوبکرؓ کی بریت بھی خود بخود آگئی کیونکہ جب حضرت عائشہؓ پر سے اللہ تعالےٰ نے اعتراض دور کر دیا تو حضرت ابوبکرؓ پر سے خود ہی اعتراض دور ہوگیا۔
قرآن کریم میں بھی اسی قسم کے خیالات کے لوگوں کا ذکر ہے۔ چنانچہ حضرت مریم کی نسبت اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ جب ان کے ہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے تو لوگوں نے ان سے مخاطب ہوکر کہا یٰمریمُ لقد جئتِ شیئًا فریا۔ یااختَ ھارون ماکان ابوکِ امرأ سوءٍ وّماکانت اُمُّکِ بغیًّا (مریم ع) ترجمہ۔ اے مریم تو نے ایک حیرت انگیز کام کیا ہے۔ اے ہارون کی بہن تیرا باپ تو بُرا آدمی نہ تھا اور نہ تیری ماں فاحشہ تھی۔ یعنے یہ کس طرح ہوا کہ ان نیکوں کی اولاد خراب ہوگئی ہو۔ خراب اور بدکار تو بدوں کی اولاد ہوتی ہے۔ اللہ تعالےٰ نے حضرت مریم کو بھی وہ جواب سکھایا کہ ان کا منہ بند ہوگیا یعنے انہوں نے اس اعتراض کے جواب میں صرف اتنا کیا کہ فاشارت الیہ

(سورہ مریم رکوع ۲) حضرت مسیح علیہ السلام کی طرف اشارہ کر دیا۔ یعنی ان کو انہی کے معیار سے ملزم کیا۔ انکا تو یہ اعتراض تھا کہ بد کی اولاد بد ہوتی ہے اور نیک کی نیک حضرت مریم علیہا السلام نے حضرت مسیح کی زندگی کو پیش کر دیا کہ اگر یہ معیار درست ہے تو دیکھو یہ میرا لڑکا کیسا ہے؟ اگر تمہارا خیال درست ہے تو پھر بدکاری کے نتیجہ میں یہ نیک اور نمونہ پکڑنے کے قابل لڑکا کہاں سے پیدا ہو؟ تمہارے اصل کے مطابق تو خود اس لڑکے کا چال چلن ہی میری بریت کیلئے کافی ہے۔ چنانچہ ان کے اس دعویٰ کی تصدیق میں اللہ تعالےٰ نے حضرت مسیح کا یہ دعویٰ پیش کرتا ہے۔ قال انی عبد اللہ اٰتنی الکتاب وجعلنی نبیا وجعلنی مبارکًا این ما کنت واوصٰنی بالصلوٰۃ والزکوٰۃ ما دمت حیا وبرًّا بوالدتی ولم یجعلنی جبارًا شقیا والسلام علیّ یوم وُلِدتُّ ویوم اموت ویوم اُبعث حیًّا۔ ذٰلک عیسی ابن مریم۔ (سورہ مریم رکوع ۲) ترجمہ۔ مسیح نے اسپر کہا کہ میں اللہ کا بندہ ہوں اسنے مجھے کتاب دی ہے اور مجھے نبی بنایا ہے اور مجھے مبارک کیا ہے۔ جہاں بھی میں رہوں اور مجھے تاکید کی ہے کہ جبتک میں زندہ رہوں عبادت اور زکوٰۃ کی ادائیگی پر کاربند رہوں۔ اور مجھے اسنے اپنی ماں سے بہت ہی نیک سلوک کرنے والا بنایا ہے (یعنے اگر میری ماں بدکار ہوتی تو اللہ تعالےٰ اس سے نیک سلوک کرنیکا خاص حکم کیوں دیتا؟ اور اس کی مرضی کا پاس کیوں رکھتا؟) اور مجھے لوگوں کے حقوق چھیننے والا اور نیکی سے محروم رہنے والا نہیں بنایا۔ اور اس نے میرے تینوں زمانوں پر سلامتی نازل کی ہے جب میں پیدا ہوا اس وقت بھی اور جب میں مرونگا اور جب دوبارہ اٹھوں گا اس وقت بھی ایسا ہی ہوگا۔ مریم کا بیٹا عیسیٰ ایسا تھا یعنی ایسے آدمی کی والدہ پر وہ لوگ اعتراض کر سکتے تھے کہ وہ بدکار تھی۔ اور پھر مذکورہ بالا حالات کی موجودگی میں۔

مصنف ہفوات بجائے اس گندے اعتراض کے جو انہوں نے اپنی جبلی کمزوری کے ماتحت اختیار کیا ہے اگر قرآن کریم پر غور کرتے اور انسانوں کے مختلف طبقات کو دیکھتے تو مصنف فردوس آسیہ کے قول کے وہ معنے بھی کر سکتے تھے جو اوپر بیان

ہوئے ہیں اور جنپر کوئی اعتراض نہیں پڑ سکتا۔

اسی اعتراض کے تحت میں مصنف ہفوات نے ایک اور اعتراض بھی کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ مصنف آسینہ نے لکھا ہے کہ اللہ تعالے نے رسول کریم صلعم کو اپنا جمال عائشہ رض کی شکل میں دکھلایا اور پھر درمیان سے پردہ اُٹھا دیا اسپر مصنف ہفوات کو اعتراض ہے کہ کیا اللہ تعالے نے نعوذ باللہ رسول کریم صلعم کی عورتوں کی محبت دیکھکر عائشہ رض کی شکل میں حلول کیا۔

اس اعتراض کی بنا بھی کسی حدیث پر نہیں ہے۔ مصنف ہفوات کو چاہئے تھا کہ اوّل وہ حدیث لکھتے جس میں یہ بات بیان ہے پھر اعتراض کرتے اور اگر ایسی کوئی حدیث ان کو معلوم نہ تھی یا اگر کوئی تھی تو ایسی تھی کہ اس کو پیش کرتے ہوئے ان کو اپنی انصاف پسندی پر سے پردہ اُٹھنے کا احتمال تھا تو خاموش رہتے۔ اگر ایسی ہی باتوں پر اعتراض کیا جائے تو شیعہ صاحبان میں بھی ایسی روایات مشہور ہیں کہ جن کو سُنکر انسان دنگ رہ جاتا ہے۔ ایک روایت مشہور ہے کہ معراج کے دن رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے عرش پر حضرت علی رض کی ہی تصویر کو دیکھا تھا۔ پس اس قسم کی روایات اگر عوام الناس میں پھیل جائیں تو ان کی وجہ سے کسی مذہب یا اسکے ائمہ پر اعتراض نہیں ہو سکتا۔

یہ جواب تو اس بات کو مدنظر رکھکر ہے کہ ایسی کوئی صحیح حدیث اہل سنت میں نہیں ہے جس سے معلوم ہو کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رض کی شکل میں اللہ تعالے کو دیکھا۔ لیکن اگر اسکو تسلیم کر لیا جائے تو بھی اسپر کوئی اعتراض نہیں پڑ سکتا کیونکہ یہ ایک عام نظارہ ہے جس سے تمام روحانیت رکھنے والے مؤمن آگاہ ہیں اور اسپر اعتراض کرکے مصنف ہفوات نے صرف اس امر کو ظاہر کیا ہے کہ ان کو روحانیت سے ذرہ بھی مس نہیں۔

یہ امر لاکھوں مؤمنوں کے تجربہ سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ عام کشف اور رؤیا میں انسانوں کی شکل میں نظر آجاتا ہے اور اس سے یہ مراد نہیں ہوتی کہ وہ محدود ہے

یا حلول کرتا ہے بلکہ اس رویا سے صرف اس تعلق کا اظہار مراد ہوتا ہے جو اللہ تعالےٰ کو بندے سے ہے اور تصویری زبان میں اس تعلق کو ظاہر کرکے ایک گہرا نقش اس کے دل میں جما یا جاتا ہے ؎

میں نے خود کئی دفعہ اللہ تعالےٰ کو انسانی شکل میں دیکھا ہے اور مضمون رویا کے مطابق اس کی شکل مختلف طور پر دیکھی ہے۔ میں ہرگز نہیں سمجھتا کہ وہ شکل خدا تھی یا اس میں خدا تعالےٰ حلول کر آیا تھا۔ لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ وہ اللہ تعالےٰ کا ایک جلوہ تھی اور اس رویا کے مضمون کے مطابق الٰہی صفات کی جلوہ گری پر دلالت کر رہی تھی وہ ایک رویئت تھی مگر تصویری زبان میں اور اس تعلق کو ظاہر کرتی تھی جو اللہ تعالیٰ کو مجھ سے یا ان لوگوں سے تھا جنکے متعلق وہ رویا تھی حضرت استاذی المکرم مولوی نور الدین صاحب رضی اللہ عنہ خلیفۂ اول اپنی طالب علمی کے زمانہ کا ایک واقعہ سناتے تھے کہ ایکدفعہ آپکے استاذ مولوی عبد القیوم صاحب بھوپالوی نے جو مجدد عصر حضرت سید احمد صاحب بریلوی کے خلفاء میں سے تھے خواب دیکھا کہ ایک شخص کوڑھی اندھا اور دیگر ہر قسم کی بیماریوں میں مبتلا بھوپال کے باہر پل پر پڑا ہے اس سے آپنے پوچھا کہ تو کون ہے؟ تو اسنے جواب دیا کہ میں اللہ میاں ہوں۔ انہوں نے کہا کہ اللہ میاں تو سب حسنوں کا جامع ہے اور تو سب عیبوں سے پر ہے تو اسنے کہا کہ وہ بھی درست ہے لیکن میں بھوپال کے لوگوں کا خدا ہوں یعنے انہوں نے مجھے ایسا سمجھ چھوڑا ہے ؎

غرض خدا تعالیٰ کی رویئت کئی بنا پر کئی صورتوں میں مومن کو ہوتی ہے اور اسکے ایمان کی زیادتی کا موجب بنتی ہے اور اسپر اعتراض کرنا ایک جاہل اور نادان انسان کا کام ہوتا ہے واقف حقیقت اس گڑھے میں نہیں گرتا۔ پس اگر رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو حضرت عائشہؓ کی شکل میں اللہ تعالیٰ کی رویت ہوئی ہو تو اس میں کچھ تعجب کی بات نہیں اور یہ اعتراض کا مقام نہیں اکثر دفع رویا کی تعبیر ناموں کے معنوں پر ہوتی ہے۔ اگر ایسی رویا کسیکو ہو تو اسکے یہ معنی ہونگے کہ اللہ تعالیٰ اسکو ایک سلسلہ بخشیگا جو ہمیشہ قائم رہیگا۔ کیونکہ عائشہؓ کے معنے زندہ رہنے والیکے ہیں

اور اس نام کی عورت کی شکل میں اگر اللہ تعالیٰ اپنا جلوہ ظاہر کرے تو اسکے یہ معنے ہوتے ہیں کہ یہ جلوہ نہ مٹنے والا ہے اور عورت اسپر دلالت کرتی ہے کہ جلوہ امت کے متعلق ہے جو مونث ہے۔ ایسی رویا پر اعتراض کرنا کور باطنی اور روحانیت سے حرمان پر دلالت کرتا ہے۔

نجات رسول از سکرات بلعاب عائشہؓ

ایک اعتراض مصنف ہفوات نے یہ کیا ہے کہ فردوس آسیہ میں لکھا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رض سے وفات کے وقت مسواک چبوائی تاکہ آپ پر سکرات موت کی آسانی ہو۔ اور اسپر اعتراض کیا ہے کہ یہ کونسی طب کا نسخہ ہے کہ مسواک کسی کے منہ میں چبوا کر لیجائے تو اس سے سکرات موت میں آسانی ہوتی ہے۔

میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ فردوس آسیہ نہ حدیث کی کتاب ہے اور نہ اسپر اہل سنت والجماعت کے مذہب کا انحصار ہے پس اس کے حوالہ سے کوئی حدیث پیش کرنا درست ہی نہیں ہو سکتا جب کتب احادیث موجود ہیں تو انکا حوالہ دینا مصنف ہفوات کے لئے کیا مشکل تھا صاف ظاہر ہے کہ مصنف ہفوات کو اس میں اپنے ارادہ کی قلعی کھل جانیکا احتمال تھا اور وہ جانتے تھے کہ اصل حوالجات کے ظاہر ہوتے ہی بہت سی روایات کی حقیقت ظاہر ہو جائیگی۔

چونکہ یہ واقع بخاری میں بھی آتا ہے اسلئے میں بخاری کی روایت اسجگہ نقل کر دیتا ہوں۔ اس سے مصنف ہفوات کے اعتراض کی حقیقت خود بخود ظاہر ہو جائیگی امام بخاری رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے ذکر میں حضرت عائشہ رض کی روایت لکھتے ہیں۔ کانت تقول ان من نعم اللہ علیّ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم توفی فی بیتی وفی یومی وبین سحری ونحری وان اللہ جمع بین ریقی وریقہ عند موتہ۔ دخل علیّ عبد الرحمٰنؓ بیدہ السواک وانا مسندۃ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرأیتہ ینظر الیہ فعرفت انہ یحب السواک فقلت اخذہ لک فاشار برأسہ ان نعم فتناولتہ فاشتد علیہ فقلت الینہ لک فاشار برأسہ ان نعم فلینتہ فامرّہ۔ الخ بخاری باب مرض النبی صلی اللہ علیہ وسلم ووفاتہ۔ ترجمہ۔ حضرت عائشہ رضؓ فرمایا کرتی تھیں کہ اللہ تعالٰے نے جو مجھ پر احسان کئے ہیں ان میں سے ایک یہی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم میرے گھر میں اور میری باری میں فوت ہوئے ہیں اور میری گردن اور سینہ کے درمیان (یعنی اس مقام پر آپنے ٹیک لگائی ہوئی تھی) اور یہ کہ اللہ تعالٰی نے میرے اور آپکے لعاب کو آپکی وفات کے وقت جمع کر دیا۔ اور وہ اس طرح ہوا کہ عبدالرحمٰنؓ (حضرت رضؓ کے بھائی) اندر آئے اور ان کے پاس مسواک تھی اور میں نے اس وقت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ٹیک دی ہوئی تھی میں نے دیکھا کہ آپ مسواک کی طرف دیکھ رہے ہیں اور میں نے سمجھا کہ آپ مسواک کرنا چاہتے ہیں پس میں نے آپ سے دریافت کیا کہ کیا آپ کے لئے یہ مسواک لیلوں ؟ آپنے سر سے اشارہ فرمایا کہ ہاں۔ میں نے مسواک لیکر آپکو دی لیکن آپکو وہ سخت معلوم ہوئی اسپر میں نے کہا کہ کیا میں اسے آپکے لئے نرم کر دوں ؟ آپ نے سر سے اشارہ فرمایا کہ ہاں۔ پس میں نے مسواک کو نرم کر دیا اور آپنے اپنے منہ میں مسواک کرنی شروع کر دی۔

دو طرح اور بھی بخاری میں یہ روایت آئی ہے لیکن مفہوم یہی ہے۔ اس امر کا کہیں بھی ذکر نہیں کہ عائشہ رضؓ کی مسواک کرنے سے آپ پر سکرات موت کی سہولت ہوگئی جبکہ مصنف ہفوات نے بخاری کو بہ نیت اعتراض پڑھا تھا تو ضرور اس روایت پر بھی ان کی نظر پڑی ہوگی۔ پھر اسکو چھوڑ کر فردوس آسیہ کی طرف توجہ کرنے کی یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ اس حدیث پر اعتراض نہیں پڑ سکتا تھا بلکہ اگر وہ اس حدیث کو نقل کر دیتے تو اس سے اعتراض ہی رد ہو جاتا کیونکہ اس حدیث میں اس روایت کے بالکل خلاف مضمون ہے۔ فردوس آسیہ کی عبارت سے مصنف ہفوات نے یہ مطلب نکالا ہے کہ گویا حضرت عائشہ رضؓ کی برکت سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم

کی سکرات میں کمی ہوئی حالانکہ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہ رضہ اسکو ایک فخر سمجھتی ہیں کہ مجھے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے آخری وقت میں خدمت کا موقع ملا۔ بخاری میں اسی موقع کے متعلق ایک اور روایت ہے اور وہ بھی حضرت عائشہ رضہ سے مروی ہے۔ اس سے اس بہتان کی قباحت اور فضاحت اور بھی زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔ کتاب فضائل القرآن میں امام بخاری حضرت عائشہ رضہ سے باب المعوذات کے نیچے ایک روایت لکھتے ہیں جو یہ ہے عن عائشة ان رسول الله صلے الله علیه وسلم کان اذا اشتکیٰ یقرأ علیٰ نفسه بالمعوّذات وینفث فلما اشتد وجعه کنت اقرأ علیه وامسح بیده رجاء برکتها۔ ترجمہ۔ حضرت عائشہ رضہ فرماتی ہیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو جب کوئی بیماری ہوتی آپ اپنے جسم پر معوذات پڑھکر پھونک لیا کرتے۔ پس جب آپکی بیماری بڑھ گئی تو میں ان سورتوں کو پڑھکر آپکا ہاتھ جسم پر پھیر دیتی اور آپکا ہاتھ اسلئے پھیرتی تا برکت ہو۔

اس روایت سے ظاہر ہے کہ حضرت عائشہ رضہ یا ائمہ حدیث کے ذہن کے کسی گوشہ میں بھی یہ بات نہ تھی کہ حضرت عائشہ رضہ کو ایسی برکت حاصل تھی کہ ان کے لعاب کے رسول کریم صلعم کے لعاب سے ملجانے سے آپ پر سکرات موت آسان ہو جائینگے۔ اگر یہ بات ان کے ذہن میں ہوتی اور وہ بقول مصنف ہفوات اس خیال کے پھیلانے کے خواہشمند ہوتے تو وہ مذکورہ بالا حدیث کو کیوں اپنی کتب میں درج کرتے۔

خلاصہ یہ کہ صحیح احادیث میں یہ بات کہیں بھی بیان نہیں ہے کہ حضرت عائشہ رضہ کو رسول کریم نے فرمایا کہ مجھے مسواک اسلئے چبا کردے کہ مجھپر سکرات موت آسان ہو جائے گی۔

جس بات کو مصنف ہفوات نے چھپایا ہے میں اسکو ظاہر کر دیتا ہوں کہ عقیلی کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں امضغیه ثم أتینی به امضغه لکی یختلط ریقی بریقك لکی یهون علی عند الموت۔ اسکے معنے بے شک یہ کئے جا سکتے ہیں

کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے مسواک چبا کر دے تا موت کے وقت کا حال مجھپر آسان ہو۔ لیکن اسکے بھی یہ معنے نہیں نکل سکتے کہ لعاب عائشہ رض میں کوئی ایسی برکت تھی بلکہ زیادہ سے زیادہ یہ معنی نکلیں گے کہ آپ کو چونکہ عائشہ رض سے محبت تھی اور پیاروں کا قرب انسان کی تسلّی کا موجب ہوتا ہے اسلئے جس طرح آپ کبھی اس جگہ منہ لگا کر پانی پی لیتے تھے جس جگہ منہ لگا کر عائشہ رض نے پیا ہو۔ اسی طرح آپ نے اس وقت ایسی خواہش کی ۔

مگر میرے نزدیک حق یہی ہے کہ یہ روایت باطل ہے۔ کیونکہ گو اس روایت سے قطعی طور پر وہی معنے نہیں نکلتے جو مصنف ہفوات نے کئے ہیں۔ لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ جو معنے بھی اسکے کئے جائیں وہ واقعات کے خلاف ہیں۔ بخاری کی روایت جو میں اوپر بیان کر آیا ہوں اور دوسری روایات جنکو میں نے بخوف طوالت نقل نہیں کیا یہ روایت ان کے خلاف ہے۔ اور اسلئے قابل اعتبار نہیں۔ بخاری اور دوسری معتبر کتب حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اسوقت ایسے ضعیف ہو چکے تھے کہ اس قدر بھی گفتگو نہیں کر سکتے تھے۔ بخاری کی حدیث میں صاف لکھا ہے کہ حضرت عائشہ کے دریافت کرنے پر کہ کیا آنحضرت صلعم مسواک لینا چاہتے ہیں؟ آپ نے منہ سے ہاں نہیں فرمایا بلکہ سر کا اشارہ فرمایا اور پھر جب آپ چبا نہیں سکے تو خود منہ سے نہیں فرمایا کہ اسکو چبا دو بلکہ حضرت عائشہ رض کے پوچھنے پر بھی سر سے فرمایا کہ ہاں چبا دو۔ پس جبکہ خود حضرت عائشہ رض کی روایت معتبر کتب احادیث میں یوں درج ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسواک چبانے کے لئے منہ سے کچھ نہیں کہا بلکہ صرف سر ہلایا۔ تو عقیلی کی روایت جس میں ایک فقرہ کا فقرہ درج ہے کس طرح درست ہو سکتی ہے؟ اور جبکہ وہ روایت اہل سنت کی معتبر کتب کی روایات کے خلاف ہے تو اسے ائمہ حدیث اور اہل سنت کے خلاف کس طرح استعمال کیا جا سکتا ہے؟

حضرت عائشہ رضہ کے ہاتھ دکھانے سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سکرات موت سے نجات ہوئی؟

مصنف ہفوات نے فردوس آصفیہ کے ہی حوالہ سے ایک اور اعتراض ائمہ حدیث پر کیا ہے اور وہ یہ کہ ان کی روایات کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سکرات موت سے نجات اس طرح ہوئی کہ آپکو حضرت عائشہ رضہ کے ہاتھ اور ہتھیلیاں دکھائی گئی تھیں ؎

اس روایت کو درج کرکے مصنف ہفوات نے یوں اعتراض کیا ہے "غنیمت ہے کہ پیغمبر معصوم کو دوزخ نہ دکھائی ہاتھ ہتھیلیوں ہی پر خیر گزری ورنہ ان خوش اعتقاد مولویوں سے یہ بھی دور نہ تھا" پھر لکھا ہے:-

"لطیفہ۔ معلوم ہوتا ہے کہ جناب عائشہ رضہ کے ہاتھوں کی قوت مقناطیسی بلکہ قوت برقی بڑھتے بڑھتے ملک الموت کا کام کرنے لگی تھی ماشاء اللہ"

جس شرافت جس ادب جس سنجیدگی کے ساتھ اس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عائشہ رضہ کا ذکر کیا گیا ہے وہ مصنف ہفوات کے اندرونے کے ظاہر کرنے کے لئے خود ہی کافی ہے۔ اسپر مزید کچھ لکھنے کی مجھے ضرورت نہیں۔ میں اصل اعتراض ہی کے جواب پر کفایت کرتا ہوں۔ یہ حدیث جس کی طرف مصنف ہفوات نے اشارہ کیا ہے مسند احمد بن حنبل اور ابن سعد کی ہے۔ مسند احمد بن حنبل میں یہ الفاظ ہیں عن عائشۃ رضہ ایضاً ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال انہ لیھون علی الموت لانی رأیت بیاض کف عائشۃ فی الجنۃ۔ یعنی حضرت عائشہ رضہ نے یہ بھی روایت کی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھ پر موت آسان ہوگئی ہے کیونکہ میںنے عائشہ رضہ کے ہاتھوں کی سفیدی کو جنت میں دیکھا ہے اور ابن سعد نے مرسل طور پر اس روایت کو یوں بیان کیا ہے انہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لقد رأیتھا فی الجنۃ حتی لیھون علیّ بذلک موتی کانی اری کفیھا یعنی عائشۃ۔ ترجمہ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میںنے جنت میں اسکو دیکھا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے

کہ مجھپر موت آسان ہوگئی ہے گویا کہ میں عائشہ رضؓ کی ہتھیلیوں کو جنت میں دیکھ رہا ہوں

اصل روایات کو پڑھ لینے کے بعد کوئی عقلمند وہ اعتراض نہیں کرسکتا جو مصنف ہفوات نے کئے ہیں۔ ان روایات سے نہ اشارۃً نہ کنایۃً یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ حضرت رضؓ کی ہتھیلیاں دکھانے کے سبب سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی روح نکل گئی نہ یہ کہ ہتھیلیوں کے دیکھنے کے سبب سے آپ کی سکرات موت کم ہوگئیں یہ تمام کی تمام بات ایک سرتاپا جھوٹ ہے جس کے کہ مصنف ہفوات اور ان کے ہم آہنگ لوگ خاص طور پر مشاق معلوم ہوتے ہیں۔

اس حدیث کے الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ عائشہ رضؓ کو جنت میں دیکھکر آپ پر موت آسان ہوگئی ہے اور اسپر کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ ہر انسان خواہ نبی ہو خواہ غیر نبی بلکہ نبی زیادہ اس امر کی فکر رکھتا ہے کہ اسکے عزیز اور رشتہ دار بھی خدا کے غضب سے بچ جائیں اور اسکے فضلوں کے وارث ہوں۔ پس رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت عائشہ رضؓ کا جنت میں دکھایا جانا واقع میں ایک خوشی کا امر تھا اور اسپر آپکا یہ فرما دینا کہ مجھپر یہ بات دیکھکر موت آسان ہوگئی ہے۔ آپ کی شان کو بڑھانیوالا ہے نہ کہ آپکی شان کے خلاف۔ جس نبی کی نسبت اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لعلك باخع نفسك الا یکونوا مؤمنین (الشعراء ع ۱) کیا تو اپنی جان کو ہلاک کردیگا اس غم میں کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے۔ کیا اس کو اپنے اہل کی نسبت اس امر کی خواہش نہیں ہوگی کہ وہ بھی انعامات الٰہیہ کے وارث ہوں اور کیا اگر اللہ تعالیٰ اسکے بعض اہل کی نسبت اس امر کی خوشخبری دے کہ وہ بھی اعلےٰ درجہ کے انعامات کے وارث ہوں گے۔ اور ان کے جسم خاص طور پر روشن بنائے جائینگے تو اس کی آخری گھڑیاں خوشی سے معمور نہ ہونگی؟ اے کاش مصنف صاحب ہفوات اپنے پتھر سے زیادہ سخت دل اور معکوس کوزے سے زیادہ ایمان سے خالی قلب سے اس واقعہ کو نہ جانچتے بلکہ ایک مومن دل کی حالت سے اندازہ لگاتے تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ یہ حدیث رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کے خلاف

نہیں ہے بلکہ آپ کی شان کو بڑھانیوالی ہے اور اسی طرح حضرت عائشہ رضؓ کی عظمت کا اظہار کرنے والی ہے۔ اور غالباً یہی باعث ہے کہ مصنف ہفوات کو یہ حدیث گراں گذری ہے اور ان کو اپنے دماغ پر پورا زور دیکر عجیب قسم کے بے تعلق اعتراض ایجاد کرنے پڑے ہیں۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اس روایت میں سکرات موت کا کوئی ذکر نہیں ہے بلکہ یہ واقع موت سے کسی قدر پہلے کا معلوم ہوتا ہے اور موت کے آسان ہونے کے معنے دل کی خوشی کے ہیں نہ کہ موت کی ظاہری تکالیف کے۔ کیونکہ اس قسم کی تکلیف ایک طبعی امر ہے اور دل کی خوشی یا عدم خوشی کا اس سے کچھ تعلق نہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر بد اخلاقی کا الزام

فردوس آسیہ ہی کے حوالہ سے کشف الغمہ عن جمیع الائمہ کی ایک روایت درج کرکے مصنف ہفوات نے ایک اعتراض ائمہ حدیث پر یہ کیا ہے کہ انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر بے شرمی کا الزام لگایا ہے۔ وہ روایت بقول مصنف ہفوات یہ ہے کہ "جب آنحضرت میرے (عائشہ رضؓ کے) گھر تشریف لاتے تو دونوں گھٹنے میرے دونوں زانوؤں پر رکھتے اور دونوں ہاتھ مونڈھوں پر اور مجھ پر اوندھے ہو جاتے اور سانس چڑھ جاتی تھی"۔

میں پہلے لکھ آیا ہوں کہ فردوس آسیہ کوئی حدیث کی کتاب نہیں ہے اور نہ اس کی روایات اہل سنت کی مسلمہ ہیں بلکہ ہم اسکے مصنف کی حالت تقوٰی اور علم کو بھی نہیں جانتے۔ پس اس کی روایات پر بنا رکھنا ایسا ہی ہے جیسا کہ شیعہ مذہب پر اعتراض کرنے کے لئے کوئی شخص حشاشین اور بھنگی چرسی فقیروں کے اقوال پر اپنے دلائل کی بنا رکھے کیونکہ اس قسم کی کتب کے مصنفین کی اصل غرض عجیب و غریب روایات کا جمع کرنا ہوتی ہے نہ کہ تحقیق و تدقیق۔

اسی طرح فردوس آسیہ نے جس کتاب سے یہ روایت نقل کی ہے وہ کتاب بھی حدیث کی

علم کے لئے مستند نہیں ہے۔ امام شعرانی ان علماء میں سے ۔ ۔ ۔ ۔ ہیں جو روایت کی تحقیق سے زیادہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ہم کسی روائت سے عبرت کیا حاصل کر سکتے ہیں پس خواہ روایت جھوٹی ہو خواہ سچی وہ اسکو درج کر دیتے ہیں۔ انہوں نے صوفیاء کرام کے سوانح میں جو کتاب لکھی ہے اس میں ایسی روایات بہت سی جمع کر دی ہیں جو گو شیعوں کی روایات کا تو مقابلہ نہیں کر سکتیں مگر پھر بھی عقل کو چکرا دینے کیلئے کافی ہیں۔ اور ان کی غرض اس قسم کی روایات کو نقل کر دینے سے محض یہ ہوتی ہے کہ ہم ان سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ مگر محقق صوفیاء اور محقق ائمہ حدیث کا یہ طریق نہیں ہے وہ جب روایات کو جمع کریں گے تو بے شک ہر قسم کی حدیث جو اس خاص قانون کے مطابق ہو جسے انہوں نے اپنی تصنیف کے وقت مدنظر رکھا ہو درج کر دینگے لیکن استعمال کے وقت اس امر کو مدنظر رکھیں گے کہ آیا کوئی حدیث تمام پہلوؤں کو مدنظر رکھتے ہوئے کس پایہ کی ہے۔

اس بات کو کھول دینے کے بعد کہ فردوس آسیہ کا مصنف نہ امام شعرانی روایت کے معاملہ میں اس مقام پر ہیں کہ ان کی بیان کردہ روایت حدیث کی تحقیق کے متعلق کوئی وقعت رکھتی ہو۔ میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ مجھے کشف الغمہ میں وہ روایت نہیں ملی جو مصنف ہفوات نے درج کی ہے۔ ہاں ایک حدیث اس میں ایسی موجود ضرور ہے جس کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف ہفوات کا اسی کی طرف اشارہ ہے۔ مگر اس حدیث کے الفاظ اور ہیں اور مطلب اور۔

میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ حدیث کس پایہ کی ہے کیونکہ کشف الغمہ کے مصنف مستقل محدث نہیں ہیں اور انہوں نے حوالہ بھی نہیں دیا کہ معلوم ہوتا کہ انہوں نے اس حدیث کو کہاں سے نقل کیا ہے تا اس کی حقیقت معلوم کی جاتی لیکن اس بات میں کچھ شک نہیں کہ کشف الغمہ کی روایت خواہ سچی ہو خواہ جھوٹی اس اعتراض کی حامل نہیں ہو سکتی جو مصنف ہفوات نے کیا ہے مزید وضاحت کیلئے میں اس روایت کے الفاظ کشف الغمہ میں سے درج کر دیتا ہوں جو یہ ہیں "کان صلی اللہ علیہ وسلم اذا دخل علیؓ وضع رکبتیہ علی فخذیہ ویدیہ علی عاتقیہ ثم اکبّ فاحتنی علیہ" یعنے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب میرے گھر آتے

تشریف لاتے تو میری رانوں پر اپنے گھٹنے ٹیکتے اور میرے کاندھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیتے پھر میری طرف جھکتے اور مجھ سے شفقت و پیار کا معاملہ کرتے" جلد دوم صفحہ ۹۰ مطبوعہ مطبع عامرہ بمصر۔ کشف الغمہ کی اصل روایت اور ہفوات المومنین کی بیان کردہ عبارت میں یہ نمایاں فرق نظر آرہا ہے کہ اس میں سانس چڑھ جاتی تھی کے الفاظ بالکل موجود نہیں۔ اور اگر یہ روایت کسی اور جگہ بھی درج ہے اور اس میں یہ الفاظ موجود ہیں تو مصنف ہفوات کا فرض ہے کہ اس کا حوالہ دے۔

اصل بات یہ ہے کہ ان الفاظ کو جدا کر کے اعتراض کی جان نکل جاتی ہے کیونکہ شہوت و بوالہوسی کی روح انہی الفاظ سے پیدا ہوتی ہے پس اگر فردوس آسیہ میں یہ الفاظ موجود بھی ہیں تب بھی باوجود اسکے کہ عام طور پر یہ کتاب ملجاتی ہے کشف الغمہ سے حوالہ نہ دینے کی غرض ہی مصنف ہفوات کی یہ معلوم ہوتی ہے کہ کسی طرح ایک اعتراض کی اور زیادتی ہو جائے مصنف ہفوات کا منشا اس روایت کے نقل کرنے سے یہی ہے کہ وہ اسے حالت جماع کا نقشہ قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ اس تلطف و مہربانی کا اظہار ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیویوں پر فرمایا کرتے تھے۔ اور جو تمدن و اخلاق کی اساس ہے۔ جس قدر متمدن اقوام ہیں ان میں یہ بات خصوصیت سے پائی جاتی ہے کہ خاوند کو اپنے گھر میں داخل ہونے پر بیوی سے خاص طور پر تلطف سے پیش آنا چاہیے اور اس روایت میں اگر یہ صحیح ہے اسی نقشہ کو کھینچا ہے اور اس روایت کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ اس میں اس حالت کا ذکر ہے جبکہ حضرت عائشہ رضہ بیٹھی ہوا کرتی تھیں۔ کیونکہ رانوں پر گھٹنوں کا ٹیکنا اور کندھوں پر ہاتھوں کا رکھنا بیٹھنے یا کھڑے ہونے کی حالت کو بتاتا ہے نہ کہ لیٹنے کی حالت کو۔ عاتق پر ہاتھ ہمیشہ بیٹھے یا کھڑے ہوئے انسان کے رکھا جا سکتا ہے۔ اور یہ بات تو بچے بھی جانتے ہیں کہ لیٹے ہوئے آدمی کی رانوں پر اگر گھٹنوں کو ٹیک دیا جائے تو وہ سخت تکلیف کا موجب ہوتا ہے نہ کہ محبت کے اظہار کا ذریعہ۔ غرض جو مفہوم مصنف ہفوات نے اس روایت سے سمجھا ہے وہ ہرگز درست نہیں بلکہ اسکے الفاظ سے فقط یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ جب گھر میں گھسنے تو اپنی بیویوں کو پیار کرتے اور یہ قابل اعتراض بات نہیں بلکہ ایک اسوہ حسنہ ہے بشرطیکہ کوئی بے رحم سنگدل یار یا کار صوفی نہ ہو۔

بہتان در اعانت شرک از پیغمبر

ایک نئے اعتراض کے پیدا کرنے کیلئے پھر وہی کتاب فردوس آسیہ مصنف ہفوات کے ہاتھ میں آئی ہے اور اب کے بھی اسی غرض کیلئے کہ اگر اصل کتاب کا حوالہ وہ دیدیں تو اعتراض باطل ہو جاتا ہے۔ وہ فردوس آسیہ کے حوالہ سے سنن ابوداؤد کی یہ روایت درج کرتے ہیں کہ "(جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جنگ تبوک سے واپس آئے) تو حضرت عائشہ رضؓ کی گڑیوں کا پردہ ہوا سے اڑ گیا آنحضرت نے پوچھا یہ کیا ہے؟ حضرت عائشہ رضؓ نے عرض کیا کہ یہ میری بیٹیاں ہیں اون میں ایک پردار گھوڑا بھی تھا۔ آنحضرت نے پوچھا کیا گھوڑے کے پر بھی ہوا کرتے ہیں؟ حضرت عائشہ رضؓ نے عرض کیا کیا حضرت سلیمانؑ کے گھوڑے کے پر نہ تھے؟ پس آنحضرت ہنسکر چپ ہو گئے" اس روایت کو نقل کر کے مصنف ہفوات ان الفاظ میں اعتراض کرتا ہے "راوی نے حضرت عائشہ رضؓ میں طباعی کی فضیلت ظاہر کرنے کی دھن میں رسالت کو غارت کر دیا۔ کیونکہ ذی روح کی تصویر سایہ دار کے دیکھنے پر پیغمبر خدا کا ہنسکر چپ رہجانا نافی رسالت ہے۔ بلکہ ان تصاویر کا گھر سے اخراج بلکہ احراق شرط تھا جو نہ ہوا اس وجہ سے پیغمبر بشیر و نذیر نہ رہے کیونکہ ان سے نہی عن المنکر ترک ہو گیا پس اس بنا پر ماننا پڑیگا کہ معاذ اللہ آیہ ان الشرک لظلم عظیم الحاقی ہے" صفحہ ۲۲۔ ایڈیشن دوسرا۔

دوسرا اعتراض مصنف ہفوات نے یہ کیا ہے کہ تبوک کے وقت حضرت عائشہ کی عمر سترہ سال کی تھی اور اس عمر میں بیاہی لڑکیاں بالعموم گڑیاں نہیں کھیلا کرتیں۔

یہ حدیث بے شک ابوداؤد میں ہے۔ لیکن اس میں ایک جملہ ایسا بھی ہے جو مصنف ہفوات کے اعتراض کے ایک حصہ کو باطل کر دیتا ہے اور غالباً اسی وجہ سے انہوں نے ابوداؤد کو نکالکر نہیں دیکھا بلکہ فردوس آسیہ کے حوالہ سے اعتراض کر دیا ہے اور وہ جملہ یہ ہے "قدم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم من غزوۃ تبوک او خیبر" یعنی جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ تبوک سے یا خیبر سے واپس تشریف لائے تھے تب یہ واقع ہوا تھا۔ اس جملہ سے ظاہر ہے کہ راوی کو وقت کے متعلق شک ہے کہ وہ کونسا تھا تبوک اور خیبر میں دو سال سے زائد کا

فرق ہے یعنی غزوۂ خیبر دو سال پہلے ہوا ہے۔ پس اگر خیبر کو صحیح سمجھا جائے تو اس وقت حضرت عائشہ رضؓ کی عمر پندرہ سال سے کچھ کم ہی بنتی ہے لیکن جبکہ راوی وقت کے متعلق خود شک میں ہے اور اس شک کا اظہار کرتا ہے اور دو ایسے جنگوں کا نام لیتا ہے جن میں دو سال سے زیادہ کا فرق ہے تو کیا تعجب ہی کہ درحقیقت جس جنگ کے بعد یہ واقع ہوا ہے وہ ان دونوں جنگوں کے سوا کوئی اور جنگ ہوا اور خیبر سے بھی پہلے ہوا اور یہی قرین قیاس معلوم ہوتا ہے اور اسی شک کو پوشیدہ رکھنے کیلئے غالباً مصنف ہفوات نے سنن ابو داؤد کی روایت کو نقل نہیں کیا جو زیادہ معروف کتاب ہے، اور فردوس آسیہ کا حوالہ دیدیا ہے۔

اب میں اس اعتراض کا جواب دیکر کہ حضرت عائشہ رضؓ کی عمر گڑیاں کھیلنے کی اجازت دے سکتی تھی کہ نہیں؟ اس دوسرے سوال کا جواب دیتا ہوں کہ کیا گڑیاں کھیلنا شرک ہی اور کیا ذی روح کی تصویر یا تمثال سے کھیلنا شرک ہی۔ اور ان الشرك لظلم عظیم کی آیت کے خلاف ہے؟۔

اوّل تو میں مصنف ہفوات اور ان کی طرز کے لوگوں سے پوچھتا ہوں کہ کیا وہ روپیہ پیسہ کا استعمال کرتے ہیں یا نہیں؟ کیا اسی کتاب کے چھپوانے پر ان کو کاتبوں۔ پریس مینوں مطبع والوں۔ کاغذ فروشوں کو ان کی مزدوری اور ان کے بل ادا کرنے پڑے تھے یا نہیں؟ اور وہ بل کس سکہ میں انہوں نے ادا کئے تھے؟ کیا جس وقت وہ رائج الوقت سکہ کو استعمال کرتے ہیں یا کسی سے لیکر اپنی جیب میں ڈالتے ہیں تو اپنے آپ کو مشرک قرار دیا کرتے ہیں؟ یا مؤمن سمجھتے ہیں؟ ان گڑیوں پر اس طرح غضبناک ہو کر اعتراض کرنا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ادب کو بھی نظر انداز کر کے یہ فقرہ لکھ دینا کہ ”رسالت کو غارت کر دیا“ بتاتا ہے کہ وہ شرک کے بڑے سخت دشمن ہیں لیکن کیا روپیہ پیسہ کا استعمال انہوں نے چھوڑ دیا ہے یا ان کے کسی بزرگ مجتہد نے چھوڑ دیا ہے؟ حالانکہ روپیہ اور نوٹ اور پیسہ سب پر ذی روح کی تصویر ہوتی ہے۔

اسی طرح کیا آپنے یا آپکے ہم خیال لوگوں نے آئینہ دیکھنا چھوڑ دیا ہے کہ اس میں بھی ذی روح کی تصویر بن جاتی ہے۔ اگر کہو کہ اس تصویر کو ہم تو نہیں بناتے۔ مگر سوال یہ ہے کہ آپ اس کو

دیکھتے بھی ہیں یا نہیں یا آئینہ کا احراق کردیا کرتے ہیں کہ اسکے ذریعہ سے اوراسی ذی روح کی تصویر بنجاتی ہے۔ اگر کہیں کہ وہ تو عارضی تصویر ہوتی ہے قائم نہیں رہتی تو کیا عارضی طور پر گڑیاں بنا کر پھران کو توڑ ڈالنا جائز ہے؟ اوراس طرح شرک نہیں رہیگا۔ اگر یہ درست ہے تو گڑیاں سب ہی ٹوٹتی رہتی ہیں ان کو کون ہمیشہ کیلئے رکھتا ہے؟

مجھے افسوس آتا ہے جب میں دیکھتا ہوں کہ لوگ اپنی نادانی اور جہالت سے اسلام کو نہایت تنگ اور محدود مذہب بنا دیتے ہیں حالانکہ جس طرح کسی مذہب میں اپنے پاس سے بڑھا دینا منع ہے اسی طرح اس میں سے کسی حصہ کا کم کر دینا منع ہے۔ قرآن کریم میں جس طرح ان لوگوں کو برا کہا گیا ہے جو اپنے پاس سے احکام بنا کو خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ اسی طرح ان لوگوں کو بھی برا کہا گیا ہے جو بعض احکام الٰہی کو چھپا دیتے اور مخفی کر دیتے ہیں۔ پس ایمان کا تقاضی ہے کہ مذہب میں زیادتی اور کمی کسی قسم کی نہ کیجائے بلکہ اس کو اپنی اصلی حالت میں رہنے دیا جائے۔

شرک ایک خطرناک شئے ہے اوراسکا مرتکب خدا تعالیٰ کے غضب کو اپنے اوپر نازل کرلیتا ہے لیکن جو شخص شرک کے مفہوم کو خلاف منشائے شریعت کھینچ تان کر کچھ کا کچھ بنا دیتا ہے وہ بھی کم مجرم نہیں۔ کیونکہ وہ بھی درحقیقت اپنے آپ کو خدائی کی طاقتیں دیکر شریعت کے احکام کی وسعت و تنگی کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہتا ہے۔

تعجب ہے کہ ایک طرف مسلمانوں میں سے وہ لوگ ہیں جو کسی کی تعظیم کے لئے کھڑا ہونیکو شرک کہتے ہیں عکس اتروانے کو شرک کہتے ہیں حتیٰ کہ غلو کرتے کرتے شرک فی الرسالت کا ایک مرتبہ ایجاد کر لیتے ہیں اوراس طرح شرک کے مسئلہ کو جو خاص ذات باری سے تعلق رکھتا ہے مبہم و مخلوط کر دیتے ہیں۔ بعض بچوں کی کھیلوں تک کا نام شرک رکھدیتے ہیں۔

دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو بزرگوں کی قبروں پر سجدہ کرتے ہیں۔ ان سے مرادیں مانگتے ہیں۔ بزرگوں کے نام پر بکرے دیتے ہیں ان کے نام پر جانوروں یا بچوں یا اور چیزوں کو وقف کر دیتے ہیں ان کو عالم الغیب خیال کرتے ہیں ان کو خدائی طاقتوں کا وارث سمجھتے ہیں اور بعض تو ان کے مکان یا مزار کی طرف منہ کرکے نماز بھی پڑھ لیتے ہیں اور یہاں تک

سمجھ بیٹھتے ہیں کہ خدا تعالےٰ بھی ان سے خائف اور مرعوب ہے ع

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

کاش یہ لوگ دین کو اس کی اصلی حالت پر رہنے دیتے اور خدا تعالیٰ کے کام کو اپنے ہاتھ میں لینے کی جرأت نہ کرتے تو نہ یہ خود تکلیف میں پڑتے نہ لوگوں کے ایمان خراب ہوتے اور نہ دشمنوں کو اسلام پر ہنسی اور ٹھٹھا کرنے کا موقع ملتا۔ اور نہ یہ ضلوا و اضلوا کی جماعت میں داخل ہو کر خدا کے غضب کو بھڑکا لیتے۔

کیسی عجیب بات ہے کہ یہی لوگ جو گڑیاں کھیلنے کا نام شرک رکھتے اور حضرت عائشہ رضؓ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر بالواسطہ زبان طعن دراز کرتے ہیں قرآن کریم میں جب انی اخلق لکم من الطین کھیئۃ الطیر فانفخ فیہ فیکون طیرًا باذن اللہ (آل عمران ع۵) پڑھتے ہیں تو اس کا ترجمہ یہ کرتے ہیں۔ کہ میں مٹی سے پرندے بنا کر ان میں پھونکتا ہوں تو وہ اللہ کے حکم کے ماتحت پرندے ہو جاتے ہیں۔ اور نہیں سمجھتے کہ اگر تمثال بنانی شرک ہے تو پھر کیا مسیح علیہ السلام جو ان کے خیالوں کے مطابق پرندے بنایا کرتے تھے مشرک تھے؟ اگر مسیح علیہ السلام پرندے بنائیں اور ان کو اڑا اڑا کر دکھائیں تو وہ مشرک نہ بنیں اور وجود نبی ہو کر ایسی کھیلوں میں مشغول رہیں (حاشا وکلا ونعوذ باللہ من ذالک) تو ان کی ہتک نہ ہو لیکن حضرت عائشہ رضؓ اگر بچپن کی عمر میں گڑیوں سے کھیلیں تو یہ شرک ہو جائے اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم اگر ان کو نہ روکیں تو اس سے آیت ان الشرک لظلم عظیم۔ نعوذ باللہ من ذالک باطل ہو جائے۔

پھر یہ لوگ قرآن کریم میں پڑھتے ہیں کہ یعملون لہ ما یشاء من محاریب وتماثیل وجفان کالجواب وقدور راسیات اعملوا آل داؤد شکرا وقلیل من عبادی الشکور۔ (سبا ع۲) یعنے حضرت سلیمان کیلئے وہ لوگ ان کی مرضی کے مطابق قلعے اور مجسمے حیوانوں کے اور بڑے بڑے برتن حوضوں کی طرح کے اور بڑی بڑی دیگیں جو ایک جگہ ٹکی رہتی تھیں۔ اے داؤد کی اولاد شکر گزاری سے گزر کرو اور میرے بندوں میں سے تھوڑے ہی ہیں جو شکر گزار ہیں لیکن باوجود اس آیت کے پڑھنے کے ہر ایک قسم کا مجسمہ بنانے کو شرک قرار دیتے ہیں اگر ہر ایک قسم کا مجسمہ

بنانا شرک ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام پر یہ کیسا احسان ظاہر فرماتا ہے کہ تمہارے لئے ایک قوم جانداروں کے مجسمے بنایا کرتی تھی۔ اس صورت میں تو یہ ایک غضب بنجاتا ہے نہ کہ احسان ۔

مگر افسوس کہ یہ لوگ قرآن کریم کو آنکھیں بندکر کے پڑھتے ہیں اور دلوں پر غلاف چڑھاکر پڑھتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی سمجھوں پر پردہ پڑجاتا ہے اور یہ اسی طرح کورے کے کورے اس سے نکل جاتے ہیں۔ گویا کہ انہوں نے اسے پڑھا ہی نہیں ۔

مصنف ہفوات نے شرک کی تعریف میں ذی روح کی تصویر کو شامل کیا ہے حالانکہ قرآن کریم میں جو حضرت سلیمان علیہ السلام کی نسبت آیا ہے کہ وہ تماثیل بنواتے تھے اس لفظ تماثیل کے معنوں میں خصوصیت کیساتھ ذی روح چیزوں کے مجسمے داخل ہیں حتیٰ کہ بعض لوگوں کے نزدیک تو تمثال کہتے ہی ذی روح چیز کے مجسمے کو ہیں۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اسوقت تمثال بنانی جائز ہوتی ہوگی۔ شرک ان گناہوں میں سے نہیں ہے جو وقتاً فوقتاً بدلتا رہے اللہ تعالیٰ کی توحید اور تفرید کا ظہور اسیطرح ابتداء میں ضروری تھا جس قدر کہ آجکل ہے ۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ ہر قسم کی تمثال بنانی منع نہیں ہے بلکہ ایسی ہی صورتیں ناجائز ہیں جن کے نتیجہ میں شرک پیدا ہوجایا کرتا ہے اور اس کا احتمال ہوتا ہے یا ایسی صورتوں میں تصاویر کا استعمال منع ہے جہاں شرک کے علاوہ کچھ اور اخلاقی امور مدنظر ہوں ورنہ ان کے سوا اگر کسی اور غرض کے پورا کرنے کے لئے تصویر یا تمثال ہو تو وہ منع نہیں ہے جیسے بچوں کے کھیلنے کے لئے کھلونے بنادیئے جاتے ہیں یا گڑیاں یا اور اسی قسم کی چیزیں ان چیزوں کا تو وجود ہی ان کی حقارت کیلئے ہوتا ہے۔ ان سے شرک کا احتمال کب ہوسکتا ہے؟ یا آجتک دنیا میں کبھی ان چیزوں سے شرک ہوا ہے؟ ادنیٰ سے ادنیٰ اقوام میں بھی کبھی گڑیوں اور کھلونوں کے سبب سے شرک پیدا نہیں ہوا۔ ہاں بزرگوں اور صلحا اور قومی لیڈروں کی تصاویر یا ان کے مجسموں یا اخلاق یا مخفی طاقتوں کی خیالی تصاویر یا مجسموں سے بے شک شرک پیدا ہوتا رہا ہے اور ہوتا ہے۔ پس ان چیزوں کی تصویریں بنانی یا ان کے مجسمہ بنانے یا شرک ہیں یا شرک کے پیدا کرنیکا موجب اور ان سے بچنے اور احتراز رکھنے کا شریعت

اسلام حکم دیتی ہے؛

اسکے علاوہ شرک کے خیال سے نہیں بلکہ بعض اور مختلف وجوہ کی بنا پر خاص خاص موقعوں پر تصاویر کے استعمال کو ناپسند کیا گیا ہے۔ جیسے مثلاً تصاویر حیوانات کی جو ایسی جگہوں پر لٹکائی جائیں جہاں عبادت کیجاتی ہے۔ خواہ گھروں میں خواہ مساجد میں اور ایسے موقعوں پر صرف تصویریں ہی نہیں بلکہ ہر ایک چیز جو ایسی زینت کی ہو کہ توجہ میں یکسوئی نہ رہنے دیتی ہو اور عبادت کی سادگی میں خلل انداز ہوتی ہو۔ منع ہے۔ کیونکہ گو وہ شرک نہ پیدا کرتی ہو مگر ایک نیک کام میں روک ہوتی ہے جیسے کہ باجہ وغیرہ عبادت کے وقت بجانا درست نہیں ہے۔ وہ شرک کا موجب نہیں ہیں لیکن ان سے عبادات کی حقیقت میں فرق پڑتا ہے۔ برخلاف اسکے گڑیوں کی کھیل ایک نہایت مفید کھیل ہے اور اس سے لڑکیاں سینے پرونے اور امور خانہ داری کی تعلیم نہایت سہولت سے اور بلا طبیعت پر بوجھ پڑنے کے حاصل کر لیتی ہیں؛

روزے میں زبان چوسنا

ایک اعتراض مصنف ہفوات نے یہ کیا ہے کہ سنن ابو داؤد کی کتاب الصوم میں حضرت عائشہ رضؓ کی روایت درج ہے کہ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یقبلہا وھو صائم ویمص لسانہا۔ ترجمہ۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو بوسہ دیا کرتے تھے درآنحالیکہ آپ روزدار ہوتے تھے اور اسی طرح آپ ان کی زبان چوستے تھے؛

اسپر مصنف ہفوات یوں اعتراض کرتے ہیں "آنحضرت کے ارشاد ما عبدناک حق عبادتک کو ہم مقام تواضع وانکسار میں سمجھتے تھے لیکن روزہ میں زبان چوسنے سے معلوم ہوا کہ آپنے اپنی عبادت کی واقعیت بیان کی ہے" "ایمان سے بولو کیا خدا کے رسول روزہ میں ایسا فعل کرسکتے ہیں؟ کیا ایسا رسول امت کی ہدایت کرسکتا ہے؟ الٰہی توبہ توبہ"

یہی اعتراض مصنف ہفوات نے صفحہ ۲۵۔ ایڈیشن اول وصفحہ ۷۔ ایڈیشن ثانی پر بعنوان "طغیانی در تقبیل ومباشرت رسول بہ صوم" درج کیا ہے۔ میں اسکو بھی اس اعتراض کے ساتھ شامل کر لیتا ہوں کیونکہ اعتراض ایک ہی قسم کا ہے۔ اس جگہ مصنف ہفوات نے بخاری

کتاب الصوم باب المباشرۃ للصائم کی یہ حدیث درج کی ہے عن عائشۃ رضؓ قالت کان النبی صلعم یقبل ویباشر وھو صائم حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں نبی کریم صلعم روزہ کیحالت میں بوسہ لے لیا کرتے تھے اور مباشرت بھی کر لیا کرتے تھے۔

اس حدیث پر صاحب ہفوات نے یہ اعتراض کیا ہے کہ "باب اول میں ہم لکھ چکے ہیں کہ بحالت صوم اپنی زوجہ کا بوسہ لینا حرام نہیں لیکن مکروہ ضرور ہے پس پیغمبر معصوم کا فعل مکروہ اختیار کرنا عقل سے بعید ہے اب تقبیل کے بعد دیکھا راوی نے مباشرت کا لفظ کہا ہے۔ جو بحالت صوم بمعنی اقرب بمواقعت ہو اور وہ حرام ہے نتیجہ رسول مرتکب حرام ہوئے لہذا رسالت سے موقوف"۔ اسکے بعد باب القبلۃ للصائم میں سے حضرت عائشہ رضؓ کی یہ حدیث نقل کی ہے کان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم یقبل بعض ازواجہ وھو صائم۔ رسول کریم صلعم اپنی بعض بیویوں کا بحالت صوم بوسہ لے لیا کرتے تھے۔

صاحب ہفوات کے تمام اعتراضات کا خلاصہ یہ ہے کہ بحالت صوم زبان چوسنا۔ بوسہ لینا۔ مباشرت کرنا حرام یا مکروہ ہے اسلئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کیطرف منسوب نہیں ہوسکتا پس یہ احادیث شرارتاً بنائی گئی ہیں اور کتب احادیث سے انکا اخراج ضروری ہے۔

اخراج و احراق کے متعلق تو میں پہلے جواب دے آیا ہوں اسجگہ صرف نفس حدیث کے متعلق جو اعتراض مصنف ہفوات نے کیا ہے اسکا جواب لکھتا ہوں۔

پہلا اعتراض مصنف ہفوات کو یہ ہے کہ ابو داؤد کی روایت میں لکھا ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم روزہ میں حضرت عائشہ رضؓ کی زبان چوستے تھے۔ یہ آپ کی ذات پر حملہ ہے۔ اگر مصنف ہفوات اعتراض کرنے سے پہلے کتب اہل سنت والجماعت کو دیکھ لیتے تو ان کو اس اعتراض کے پیش کرنیکی ضرورت ہی نہ رہتی لیکن یا تو انہوں نے بوجہ تعصب یا جہالت ان کتب کو دیکھا ہی نہیں یا دیدہ و دانستہ نظر انداز کر دیا ہے۔ ابو داؤد کی شرح عون المعبود جلد ثانی صفحہ ۲۸۵ پر اس حدیث کے متعلق لکھا ہے۔ قال فی المرقاۃ قیل ان ابتلاع ریق الغیر یفطر اجماعاً واجیب علی تقدیر صحۃ الحدیث . . . انہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کان یمصقہ ولا یبتلعہ یعنی مرقاۃ میں لکھا ہے کہ دوسرے کا تھوک نگلنا بالاجماع روزہ توڑ دیتا ہے اور اس حدیث کے متعلق

بالاجماع کہا جاتا ہے کہ اگر یہ درست فرض کرلیجائے تو اس کی یہ تاویل کی جائیگی کہ رسول کریم صلعم تھوک نگلتے نہیں تھے بلکہ پھینکدیتے تھے۔ اس جواب سے ظاہر ہے کہ اہل سنت و الحدیث اس حدیث کو قابل قبول ہی نہیں سمجھتے اور اگر اسکو صحیح فرض کرلیں تو اسکا یہ جواب دیتے ہیں کہ اس صورت میں یہ تاویل کرنی پڑیگی کہ رسول کریم صلعم تھوک پھینکدیتے تھے۔ پس جب ائمہ حدیث کے نزدیک یہ حدیث ہی قابل قبول نہیں اور بصورت صحت قابل تاویل ہے تو اسپر اعتراض کیسا؟ کیا کسی شخص پر اس امر کے متعلق بھی اعتراض ہوا کرتا ہے جسے وہ مانتا ہی نہیں۔ اگر کہا جائے کہ پھر انہوں نے اس حدیث کو درج کیوں کیا ہے؟ تو اسکا جواب یہ ہے کہ جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ مؤلفین حدیث ہر حدیث جسے وہ نقل کرتے ہیں اسکے مطلب کو صحیح قرار دیکر اسے درج نہیں کرتے بلکہ اسکے لئے ان کے اور اصول ہیں اور بسا اوقات وہ ایک حدیث درج کرتے ہیں اور خود ان کو اس کے مطلب سے اختلاف ہوتا ہے۔ چنانچہ بعض دفعہ وہ ایک ہی جگہ متضاد مضامین کی روایات لاتے ہیں اور یہ بات صرف اہل سنت والجماعت کی ہی کتب حدیث میں نہیں ہے بلکہ اہل شیعہ کی کتب حدیث میں بھی ایسا ہی کیا گیا ہے چنانچہ آپ لوگوں کی سب سے معتبر کتاب فروع کافی ہے باب الرجل یجامع اهله فی السفر میں امام ابو عبد اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے عمر بن یزید اور سہل عن ابیہ اور ابو العباس سے ایسی روایات درج ہیں جن کا مطلب یہ ہے کہ رمضان میں جو شخص سفر پر ہو اسے جماع جائز ہے۔ عمر بن یزید کی روایت کے الفاظ یہ ہیں اله ان یصیب من النساء قال نعم یعنے کیا اسے جائز ہے کہ اپنی بیوی سے صحبت کرے فرمایا ہاں۔ مگر اسی جگہ سماعہ اور ابن سنان نے انہی امام ابو عبد اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت درج کیگئی ہے کہ ایسا کرنا بالکل درست نہیں اور راوی کے اعتراض کرنے پر کہ جب اسکو کھانا پینا جائز ہے تو جماع کیوں جائز نہیں؟ انکی طرف سے یہ دلیل بیان کی گئی ہے۔ ان الله رخص للمسافر فے الافطار و التقصیر رحمة و تخفیفا لموضع التعب و النصب و وعث السفر ولم یرخص له فی مجامعة النساء فی السفر بالنهار فی شهر رمضان یعنی اللہ تعالے نے مسافر کو افطار اور قصر نماز کی اجازت تکان اور تکلیف اور سفر کی کوفت کی وجہ سے دی ہے لیکن اسے دن کے وقت سفر میں رمضان کے مہینہ میں عورتوں سے جماع کرنیکی اجازت نہیں دی۔ ان دونوں حدیثوں میں کسقدر اختلاف ہے

ایک میں جماع کو جائز قرار دیا ہے دوسری میں بالکل رد کیا ہے۔ اور دونوں روایتیں ایک کتاب حدیث میں درج ہیں اور ایک ہی راوی سے درج ہیں اور بالکل پاس پاس درج ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بھول چوک سے ایسا نہیں ہوا بلکہ مصنف نے جان بوجھکر ان کو ایک جگہ جمع کیا ہے تا روایات کا اختلاف پڑھنے والیکے سامنے آجائے۔ اب یہ ظاہر بات ہے کہ مصنف دونوں باتوں کا ایک ہی وقت میں تو قائل نہیں ہو سکتا۔ ضرور ہے کہ وہ دونوں باتوں میں سے ایک کو ترجیح دیتا ہوگا مگر باوجود اسکے وہ درج دوسری روایت کو بھی کر دیتا ہے۔

اسی طرح روزہ میں خوشبو سونگھنے کے متعلق مختلف روایتیں فروع کافی میں درج ہیں خالد اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ امام ابو عبد اللہ رح روزہ میں خوشبو لگاتے اور اسے تحفہ خداوندی قرار دیتے حسن بن راشد امام ابو عبد اللہ رح سے روایت کرتے ہیں کہ خوشبو کا سونگھنا روزہ میں منع ہے۔ جلد اول صفحہ ۷۶ باب الطیب والریحان للصائم۔

غرض ہر ایک روایت جو مؤلف حدیث اپنی کتاب میں درج کرتا ہے اسکی صحت کا وہ قائل نہیں ہوتا بلکہ بعض اوقات اس حدیث کے مخالف رائے رکھتا ہے اور اس حدیث کو متروک یا منسوخ یا ضعیف یا ناقابل احتجاج سمجھتا ہے پس ابوداؤد میں اس روایت کے درج ہونے کے یہ معنی نہیں کہ ابوداؤد اس کو صحیح سمجھتے تھے اسلئے انہوں نے اس روایت کو درج کیا تھا۔

دوسرا جواب مصنف ہفوات کے اعتراض کا یہ ہے کہ اگر یہ بھی فرض کر لیا جائے کہ ابوداؤد رح نے اس حدیث کو صحیح سمجھ کر لکھا ہے تب بھی اسپر کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا اسلئے کہ یہ مسئلہ اخلاقی نہیں ہے بلکہ شرعی ہے۔ شرعی مسائل روایت سے ثابت ہوتے ہیں نہ کہ درایت سے پس اگر کسی شخص کو کسی شرعی حکم کے متعلق جو اخلاق سے تعلق نہ رکھتا ہو کوئی روایت پہنچے اور وہ اسے درج کر دے تو اس سے یہ کیونکر سمجھا جائیگا کہ اسنے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم پر اعتراض کیا ہے۔ یہ تو ایسی ہی بات ہے جیسے اہل سنت شیعوں پر اسلئے اعتراض کریں کہ ان کے نزدیک پاؤں پر مسح کیا جاتا ہے اور ان روایات کی بنا پر جو ان کے نزدیک ثابت ہیں اور جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ننگے پاؤں کے نہ دھونے سے وضو ہی باطل ہو جاتا ہے اور نماز ہی نہیں ہوتی یہ کہدیں کہ دیکھو شیعہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نہ وضو کرتے تھے اور نہ نماز

پڑھتے تھے کیونکہ ان کے نزدیک آپ وضو میں پاؤں نہ دھوتے تھے۔ کیا یہ اعتراض سنیوں کا درست گنو؟

اصل بات یہ ہے کہ اس قسم کے اعتراض اخلاقی مسائل اور عقلی مسائل کے متعلق ہوا کرتے ہیں نہ کہ شرعی مسائل کے متعلق فرض کرو کہ روزہ میں بعض ہلکی غذاؤں کا کھانا جائز ہوتا تو کیا دشمنان اسلام اسپر اعتراض کرنیکا کوئی حق رکھتے تھے کہ یہ ایک خلاف اخلاق بات ہے۔ یا مثلاً ظہر کی رکعتیں بجائے چار کے تین ہوتیں تو کیا اسپر کوئی یہ اعتراض کر سکتا تھا کہ یہ بداخلاقی ہو گئی۔ پس اسی طرح اگر کسی شخص کے نزدیک یہ ثابت ہو کہ زبان چوسنی جائز ہے کیونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایسا کر لیا کرتے تھے تو اسپر یہ تو اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ یہ روایت ثابت نہیں یا یہ کہ دوسری احادیث کی خلاف ہی یا یہ کہ اسنے ایک غلط روایت کو بیان کر دیا ہے لیکن اسپر یہ اعتراض ہرگز نہیں کیا جا سکتا سوا اسنے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانیت یا آپکے اخلاق پر کوئی اعتراض کیا ہے ایسے موقع پر یہ اعتراض کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک انسان کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ اسنے اس قسم کی حدیثیں جب پڑھیں کہ رسول کریم صلعم نے نماز کے موقع پر کوئی بچہ اٹھا لیا یا اسکو اتار دیا یا اور اس قسم کا کوئی کام کیا تو بے اختیار بول اٹھا کہ خود محمد صاحب (صلے اللہ علیہ وسلم) کا نماز لوٹ گیا۔ کیونکہ کنز میں لکھا ہے کہ حرکت کرنے سے نماز ٹوٹ جاتا ہے۔

تیسرا جواب یہ ہے کہ میرے نزدیک اس حدیث کو درست سمجھکر بھی کوئی اعتراض نہیں پڑ سکتا کیونکہ ہو سکتا ہے کہ ویمص لسانھا علیحدہ جملہ ہو یعنی راوی نے حضرت عائشہ رضہ سے یہ دو باتیں سنی ہوں کہ آنحضرت صلعم روزہ میں بوسہ لے لیا کرتے تھے اور یہ کہ آپ اپنی ازواج کی زبان بھی پیار میں چوس لیا کرتے تھے اور اسنے ان کو ایک ہی جملہ میں بیان کر دیا۔ حالانکہ اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ آپ بحالت صوم ایسا کیا کرتے تھے۔ پس اس تاویل سے اس حدیث کا مطلب بالکل صاف ہو جاتا ہے اور اسکے یہ معنی ہوتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت روزہ میں بوسہ لینا اور پیار سے زبان کا چوسنا ثابت ہوتا ہے افطار میں نہ کہ روزہ میں۔

اگر کہا جائے کہ اگر روزہ کی حالت میں ایسا نہیں کیا گیا تو پھر اسکے بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی تو اس کا جواب یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ اسوہ تھے تمام مسلمانوں کے لئے اسلئے آپکی ہر ایک حرکت کو مسلمان غور سے دیکھتے اور جو نہ معلوم ہوتی اسکے متعلق دریافت کرتے تا اپنی

زندگیوں کو اسکے مطابق بنائیں۔ اسوجہ سے آپکی تمام باتیں احادیث میں بیان کی جاتی ہیں حتیٰ کہ یہاں تک بھی بیان کیا گیا ہے کہ آپ پیار سے کبھی اسجگہ گلاس پر منہ رکھکر پانی پیتے جہاں منہ رکھکر آپکی ازواج مطہرات میں سے کسی نے پانی پیا ہوتا۔ اور غرض ان احادیث کے بیان کرنے کی یہ ہے کہ تا لوگ عورتوں سے حسن معاشرت کریں اور انکے احساسات اور جذبات کا خیال رکھیں اور ان کے حقوق کو غصب اور انکی خواہشات کو باطل نہ کریں۔

دوسرا اعتراض مصنف ہفوات کا یہ ہے کہ ان احادیث میں یہ بات لکھی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم روزہ میں بوسہ لیا کرتے تھے اور یہ بات مصنف ہفوات کے نزدیک مکروہ ہے۔ اور مکروہ فعل رسول نہیں کر سکتا۔

مجھے تعجب پر تعجب ان مسلمان کہلانیوالوں پر آتا ہے جو اپنے پاس سے شریعت بھی بنانے لگتے ہیں۔ یہ کب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ روزہ میں بوسہ لینا مکروہ ہے؟ یا آپ کی کس بات سے یہ امر مستنبط ہوتا ہے؟ خود ہی ایک مسئلہ گھڑا اور خود ہی اسے رسول پر حاکم بنا دیا جیسے کہ میں پہلے لکھ آیا ہوں مسائل اخلاقیہ ہی صرف ایسے مسائل ہیں کہ جن میں استنباط اور قیاس درست ہے لیکن تفاصیل شرعیہ ہمیشہ سند سے معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن مصنف صاحب ہفوات کا معاملہ بالکل اُلٹ ہے وہ اپنی عقل سے ایک مسئلہ تجویز کرتے ہیں اور اس سے نص صریح کو رد کر دیتے ہیں اور نص بھی وہ کہ جو عقل سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ تفاصیل شریعت سے تعلق رکھتی ہے۔ کل کو آپ کہدینگے کہ ظہر کے وقت جب کام کا یا آرام کا وقت ہوتا ہے۔ ظہر کی چار رکعت قرار دینا خلاف عقل ہے اصل میں دو چاہئیں اور فلاں حدیث میں جو یہ آتا ہے کہ رسول کریم صلعم چار رکعت ظہر کے فرض ادا کیا کرتے تھے اس میں رسول کریم پر حملہ ہے کہ گویا آپ دو کی بجائے چار پڑھکر اپنی نماز فاسد کر دیتے تھے۔ پس ان محدثین نے رسول کریم صلعم پر ایک ظلم عظیم کیا ہے اور ایسی سب احادیث اور روایات قابل احراق اور اخراج اور تنسیخ اور محدثین قابل تکفیر و تفسیق ہیں۔ برایں عقل و دانش بباید گریست۔

بوسہ کو روزہ میں مکروہ قرار دینا علماء کا اجتہاد ہے اور وہ اجتہاد بھی مشروط یعنی روزہ میں جوان کو بوسہ لینا مکروہ ہے کیونکہ وہ اپنے نفس پر قابو نہیں پا سکتا ممکن ہے کہ کسی ایسی بات

میں مبتلا ہو جائے جو شرعاً ناجائز ہے۔ اور اس فتوےٰ میں شیعہ اور سنی دونوں متفق ہیں۔ مؤطا میں عبد اللہ بن عباس رضہ کا فتویٰ درج ہے کہ ارخص فیھا للشیخ وکرھھا للشاب۔ انہوں نے روزہ میں بوڑھے کیلئے بوسہ لینا جائز قرار دیا اور جوان کیلئے منع کیا۔ عبد اللہ بن عمر رضہ کا فتویٰ صرف ایک ہی کہ بوسہ لینا دونوں کیلئے منع ہے مگر چونکہ وہ بلا قید ہے اسلئے نہیں کہہ سکتے کہ ان کا فتویٰ عام تھا یا جوانوں کے متعلق۔ امام ابوحنیفہ کا فتویٰ جو ہدایہ میں لکھا ہے یہ ہے ولا باس بالقبلۃ اذا امن علی نفسہ ویکرہ اذا لم یامن۔ یعنی جب اپنے نفس پر قابو رکھتا ہو تو جائز ہے اور اگر اپنے نفس پر قابو نہ رکھتا ہو اور خطرہ ہو کہ حد شریعت کو توڑ ڈالیگا تو مکروہ ہے۔ شافعیہ کا بھی یہی فتویٰ ہے کہ تکرہ القبلۃ للصائم الذی لا یملک اربہ یعنی اسکے لئے بوسہ لینا مکروہ ہے جو اپنی شہوت پر قابو نہیں رکھتا بلکہ امام شافعی کا قول تو یہ ہے کہ بوسہ لینا ہر حالت میں جائز ہے اگر اس سے بڑھکر کوئی شخص کوئی عمل خلاف شریعت کر بیٹھتا ہے تو اس کی سزا وہ الگ پائیگا۔ یہ تو اہل سنت کے فتوے ہیں جن سے ظاہر ہے کہ بوسہ لینا روزہ میں مکروہ نہیں بلکہ اسکے لئے مکروہ ہی جو جوان ہو اور اپنی شہوت پر قابو نہ رکھتا ہو۔ اب میں اہل شیعہ کا فتویٰ درج کرتا ہوں:-

فروع کافی جلد اول میں زرارہ کی ایک روایت امام ابوعبد اللہ سے درج ہے کہ لا تنقض القبلۃ الصوم یعنی روزہ بوسے سے نہیں ٹوٹتا۔ اسی طرح منصور بن حازم سے روایت ہی کہ میں نے ابو عبد اللہ رضہ سے پوچھا ما تقول فی الصائم یقبل الجاریۃ او المرأۃ فقال اما الشیخ الکبیر مثلی و مثلک فلا بأس و اما الشاب الشبق فلا لانہ لا یؤمن و القبلۃ احدی الشھوتین۔ ترجمہ۔ آپ اس روزہ دار کے متعلق کیا فرماتے ہیں جو لڑکی یا عورت کا بوسہ لیلے؟ آپنے فرمایا بوڑھا جیسے تو یا میں ہوں اگر بوسہ لے تو کچھ حرج نہیں اور اگر جوان ہو جو شہوت پر قابو نہ پا سکتا ہو تو اسے بوسہ لینا نہیں چاہئے کیونکہ وہ محفوظ نہیں اور بوسہ بھی ایک شہوت ہی۔ یعنی اس سے چونکہ شہوت پیدا ہوتی ہے اور وہ شخص شہوت پر قابو نہیں رکھتا اسلئے ڈر ہے کہ اس قدم کے اٹھانے سے دوسرا بھی اٹھالے (فروع کافی جلد اول صفحہ ۳۷۲)۔

مذکورہ بالا فتووں سے جو سنیوں اور شیعوں کے ہیں ثابت ہی کہ روزہ دار کو بوسہ لینا اول تو جائز ہے مگر ایسی حالت میں منع ہے جب اس سے شر میں پڑ جانیکا خطرہ ہو اور بوڑھا چونکہ

بظاہر اس شر میں پڑنے سے محفوظ ہوتا ہے اسکے لئے انہوں نے جائز رکھا ہے کہ بوسہ لیلے۔ ان فتووں کی موجودگی میں اور سب سے بڑھکر یہ کہ رسول کریم صلعم کے عمل کی موجودگی میں مصنف ہفوات کا یہ لکھنا کہ یہ ایک مکروہ فعل ہے اور رسول مکروہ فعل نہیں کرسکتا۔ کیا یہی دلالت نہیں کرتا کہ مصنف ہفوات اپنے فتوٰی پر خدا کے رسول کو بھی چلانا چاہتے ہیں اور خود شریعت بنانے کا دعوٰی رکھتے ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں جب تشریف لیگئے ہیں اسوقت آپکی عمر پچاس سے متجاوز ہوگئی تھی پس اگر فتوٰی یہی سمجھا جائے کہ بوڑھے کو بوسہ لینا جائز ہے جوان کو نہیں تو بھی آپکی طرف اس قسم کا عمل منسوب کرنا فتوٰی کے خلاف نہیں۔ اور مصنف ہفوات کے مقرر کردہ معیار کے مطابق بھی محل اعتراض نہیں۔ اور اگر اس امر کو دیکھا جائے کہ یہ عمل اس شخص کی نسبت بیان کیا گیا ہے جو خدا کے سامنے مقام شہود پر کھڑا تھا اور مقام شہود میں سے بھی سدرۃ المنتہٰی پر بار یاب ہوچکا تھا تو پھر تو یہ اعتراض اور بھی لغو ہو جاتا ہے۔ آپ تو عین عنفوان شباب میں بھی اس فتوٰی کے ماتحت نہیں تھے کیونکہ آپسے زیادہ کون شخص اپنی شہوات پر قابو رکھنے والا تھا خواہ جوان ہو خواہ پیر فرتوت۔ مصنف ہفوات کے اعتراض کے تو یہ معنی ہیں کہ گویا نعوذ باللہ من ذالک سب سے زیادہ رسول کریم شہوات میں پڑجانیکے محل تھے۔ اسلئے آپکو تو اس فعل کے قریب ہی نہیں جانا چاہئے تھا حالانکہ اس نہی کا باعث آنحضرت صلعم نے قطعی طور پر منقطع تھا اور آپ اس سے بالکل محفوظ تھے۔

شاید مصنف ہفوات اس موقع پر یہ کہدیں کہ گو رسول کریم کی عمر زیادہ ہوگئی تھی مگر آپ بہت قوی تھے اسلئے آپکے لئے یہ فعل درست نہیں ہوسکتا تھا مگر اول تو اس اعتراض کا جواب مذکورہ بالا بات میں آچکا ہے کہ آپکی نسبت تو نہی کی علت جوانی میں بھی ثابت نہیں اسلئے آپ کیلئے کوئی شرط نہیں کہ آپ بڑھاپے میں ایسا کریں اور جوانی میں نہیں لیکن اگر یہ فرض بھی کرلیا جائے کہ یہ مسئلہ شرعیہ ہے نہ کہ ایک احتیاطی حکم تب بھی اعتراض نہیں پڑسکتا کیونکہ فتوٰی کے رو سے بوڑھے کی شرط ہے نہ کہ مضبوط بوڑھے یا کمزور بوڑھے کی۔ امام ابو عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ جن کا فتوٰی کافی میں درج ہے خود اپنی نسبت جو کچھ بیان کرتے ہیں وہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ کمزور بوڑھے نہ تھے بلکہ مضبوط بوڑھے تھے۔ مذکورہ بالا حدیث کے آخری حصے میں آتا ہے کیف انت والنساء قلت

ولا شئ قال ولکنی یا ابا حازم ما اشاءُ شیئا ان یکون ذلک منی الا فعلت - ترجمہ -
(امام ابو عبداللہ راوی سے پوچھتے ہیں) تیرا عورتوں کے متعلق کیا حال ہے؟ میں نے کہا بالکل طاقت ہوں فرمایا لیکن اے ابا حازم میں جو کچھ بھی چاہوں عورتوں سے کر لیتا ہوں یعنی میری طاقت بالکل محفوظ ہے پس معلوم ہوا کہ امام عبداللہ کے نزدیک روزہ میں بوسہ لینا ہر ایک بوڑھے کو جائز ہے نہ کہ کمزور اور ناقابل بوڑھے کو ؛

خلاصۂ کلام یہ کہ روزہ دار کیلئے بوسہ لینا ہرگز منع نہیں ہے احادیث اور ائمہ اہل سنت واہل شیعہ کے فتاوی اسکے مطابق ہیں اور قیاساً اور احتیاطاً ایسے جوان کیلئے جسکو اپنے نفس پر قابو نہ ہو اس امر کو روک دیا گیا ہے ورنہ یہ شرعی حکم نہیں ہے ؛

تیسرا اعتراض مصنف ہفوات کا یہ ہے کہ حدیث میں جو یہ آتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے روزہ میں اپنی بیویوں سے مباشرت کی اور یہ ایک سخت گناہ ہے کیونکہ مباشرت اقرب بالجماع ہے جو بالکل حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ رحم کرے ان جہلاء پر جو بلا اسکے کہ خدا اور رسول کے کلام کو سمجھنے کی قابلیت رکھتے ہوں مذہب کے امور میں فقیہ بنجاتے ہیں اور اپنی ناسمجھی اور نادانی سے دین کے مسائل کو نہ سمجھکر ان کے اخراج و اخراج کا فتویٰ دیدیتے ہیں۔ مباشرت کا لفظ جس سے صاحب ہفوات کو دھوکا لگا ہے وسیع معنے رکھتا ہے۔ اسکے معنی عورت کو ہاتھ لگانے اور اس کے ساتھ چھونے کے بھی ہیں۔ اور اسکے معنی جماع کے بھی ہیں۔ لسان العرب میں لکھا ہے ومباشرۃ المرأۃ ملامستھا وقد یرد بمعنے الوطی فی الفرج وخارجا منھا۔ عورت سے مباشرت کرنا اس سے چھونے کو کہتے ہیں۔ اور کبھی اسکے معنی جماع کے بھی ہوتے ہیں۔ پھر صاحب لسان اس حدیث کی نسبت لکھا ہے۔ وفی الحدیث انہ کان یُقبِّل ویباشر وھو صائم اراد بالمباشرۃ الملامسۃ۔ یعنی حدیث میں جو آیا ہے رسول کریم صلعم روزہ کی حالت میں بوسہ لیتے تھے اور مباشرت کرتے تھے اس سے مراد چھونا اور ہاتھ لگانا ہے نہ کچھ اور۔ لسان العرب لغت کی کتابوں میں سے اہم ترین کتاب ہے اور اسکی شہادت کے بعد بھی کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں صرف اس قدر نصیحت کر دینا میں مناسب سمجھتا ہوں کہ انسان کو اعتراض کرتے وقت اس امر کو ضرور مد نظر رکھنا چاہئے کہ وہ ایسی بات نہ کہے جو قائل کے منشاء کے خلاف ہو۔ اور اگر دل سے انصاف [illegible]

توکم سے کم ایسی بات تو نہ کہے جسکا بطلان بالبداہت ظاہر ہو۔ کیونکہ اس قسم کی باتوں کا لکھنا اس امر کو ثابت کرتا ہے کہ لکھنے والا اپنی عداوت میں حد سے بڑھا ہوا ہے اور جنکے فائدے کیلئے وہ بات کہتا ہے ان پر اسکی حرکت کا یہ اثر ہوتا ہے کہ انکے دل ایسے شخص کی نسبت جذبہ حقارت و نفرت سے بھر جاتے ہیں۔

میں مصنف ہفوات کی طرز تحریر سے سمجھتا ہوں کہ ان پر کوئی نصیحت جو غیر کے منہ سے نکلی ہوئی ہو اثر نہیں کرسکتی اسلئے میں انہی کی مسلمہ کتب کے حوالہ سے بتاتا ہوں کہ مباشرت حرام نہیں ہے جیساکہ وہ لکھتے ہیں بلکہ جائز ہے۔ اور یہ بھی کہ مباشرت کے معنے کسی ایسی حرکت کے ہی نہیں ہیں جو جماع کے مشابہ ہو بلکہ اس سے مراد صرف عورتوں کا چھونا یا ان کے پاس بیٹھنا بھی ہے۔ فروع کافی جلد اول کتاب الصیام میں ایک باب ہے باب الصائم یقبّل او یباشر یعنی اس امر کے متعلق باب کہ روزہ دار بوسہ دے یا مباشرت کرے۔ اور آگے یہ حدیث لکھی ہے عن الحلبی عن ابی عبد اللہ علیہ السلام انہ سئل عن رجل یمسّ من المرأۃ شیئاً ایفسد ذٰلک صومہ او ینقضہ فقال ان ذٰلک یکرہ للرجل الشاب مخافۃ ان یسبقہ المنی یعنی حلبی نے امام ابو عبد اللہ رض سے روایت کی ہے کہ آپ نے ایک ایسے شخص کے متعلق پوچھا گیا جو عورت کو کسی طرح چھوتا ہے کیا اسکا روزہ ٹوٹ جائیگا یا خراب ہو جائیگا؟ فرمایا یہ بات نوجوان کیلئے مکروہ ہے اس ڈر سے کہ اس کی منی خارج نہ ہو جائے اس حدیث سے دو باتیں ظاہر ہیں ایک تو یہ کہ مباشرت کے معنی عورت کو چھونے کے ہیں نہ کہ کچھ اور۔ کیونکہ مباشرت کا باب مقرر کر کے عورت کے چھونے کا مسئلہ بیان کیا گیا ہے۔ دوسرے یہ کہ مباشرت حرام نہیں بلکہ جوان کیلئے مکروہ اور بوڑھے کیلئے جائز ہے اور جوان کے لئے بھی اس ڈر سے مکروہ ہے کہ اس سے کوئی ایسی بات نہ ہو جائے جو روزہ کے ٹوٹنے کا موجب ہو۔ لیکن اگر یہ وجہ کسی میں نہ پائی جائے تو کراہت کی پھر کوئی وجہ نہیں۔ اور ظاہر ہے کہ جو وجہ بتائی گئی ہے وہ کسی بیمار میں ہی پائی جاسکتی ہے تندرست اور صحیح القویٰ آدمی کے ساتھ ایسا کبھی نہیں ہوتا جو بیان کیا گیا ہے پس حقیقت کسی کے لئے بھی سوائے قلیل استثنائی صورتوں کے مباشرت منع نہیں ہتی۔ اور مباشرت کو حرام قرار دینا یا تو مصنف ہفوات کی جہالت پر یا شریعت سازی کی حد سے بڑھی ہوئی خواہش پر دلالت کرتا ہے۔

مصنف صاحب ہفوات نے جو مضحکہ اوپر کی روایات بیان کرکے اڑایا ہے اس کا جواب مکمل نہ ہوگا اگر میں اس جگہ کتب شیعہ سے چند ایک روایات درج نہ کردوں۔ کافی جلد اول صفحہ ۲۷۷ پر کتاب روزہ میں امام ابو عبداللہ کا فتویٰ درج ہے کہ ان سے پوچھا گیا کہ کیا عورت کھانا پکاتے ہوئے کھانے کا مزہ روزے میں چکھ سکتی ہے؟ تو انہوں نے کہا لا بأس۔ اس میں کوئی حرج نہیں اور اسی حدیث میں لکھا ہے کہ ان سے پوچھا گیا کہ کیا عورت روزہ کی حالت میں اپنے بچہ کو منہ میں کھانا چبا کر دے سکتی ہے؟ تو انہوں نے کہا لا بأس۔ اس میں بھی کوئی حرج نہیں۔

اسکے بعد حسین بن زیاد کی روایت لکھی ہے کہ باورچی اور باورچن بھی کھانا پکاتے ہوئے کھانا چکھ سکتے ہیں۔ مگر اس سے بڑھکر یہ کہ مسعدۃ بن صدقہ کی ایک روایت امام ابو عبداللہ سے لکھی ہے کہ حضرت فاطمہ رضہ اپنے بچوں کو رمضان کے مہینہ میں روٹی چبا چبا کر دیا کرتی تھیں۔ بلکہ ان روایات پر بھی طرہ وہ روایت ہے جس میں روزہ دار کے لئے پیاس بجھانے کا نسخہ بتایا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ امام ابو عبداللہ صاحب فرماتے ہیں کہ روزہ دار کو پیاس لگے تو اسکے بجھانے کے لئے وہ انگوٹھی منہ میں ڈال کر چوسے۔ یہ سب روایات فروع کافی کے صفحہ ۷۷ پر درج ہیں اور شیعہ صاحبان کے لئے نہایت زبردست حجت ہیں۔ ان روایات کی موجودگی میں اس روایت پر اعتراض جسے خود اہل کمزور اور ضعیف قرار دیتے ہیں مصنف ہفوات کیلئے کب جائز ہو سکتا ہے؟ وہ ان احادیث کو مدنظر رکھتے ہوئے بتائیں کہ بقول ان کے ادنیٰ امتی تو غبار سے بھی بچیں اور حضرت فاطمہ روٹیاں چبا چبا کر بچوں کو دیں اور خوب لطف اُڑائیں۔ آخر منہ میں اس قدر دیر روٹی چبانے سے ایک حصہ تو ان کے پیٹ میں بھی جاتا ہوگا۔

حضرت عائشہ رضہ کا بے اجازت حضرت زینب کے گھر میں جانا

ایک اعتراض مصنف ہفوات نے یہ کیا ہے کہ ابن ماجہ باب حسن معاشرۃ النساء میں روایت ہے کہ "مجھے معلوم نہ تھا کہ حضرت زینب مجھ سے ناراض ہیں اور میں بے اجازت اندر چلی گئی انہوں نے کہا یا رسول اللہ جب ابو بکر کی بیٹی اپنا کرتہ الٹ دے تو آپکو کافی ہے"

اس پر مصنف ہفوات کو یہ اعتراض ہے کہ (۱) کیا رسول کریم صلعم فی الواقع ایسے ہی تھے

جیساکہ حضرت زینب نے بیان کیا ہے (۲) کیا حضرت زینب ایسی تھیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی گستاخی کریں (۳) کیا حضرت عائشہ ایسی ناواقف تھیں کہ بلا اجازت گھر میں گھس گئیں۔

ان تینوں سوالوں میں سے پہلے کا جواب یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہرگز ایسے نہ تھے کہ آپکے دل پر کسی انسان کی یا کسی مخلوق کی محبت اس طرح حاوی ہوجائے کہ ماسوی کو بھلادے اور نہ حضرت زینب کے قول کا یہ مطلب ہے کہ آپ ایسے ہیں۔ بلکہ اصل الفاظ حدیث کے یہ ہیں کہ احسبك اذا قلبت لك بنیۃ ابی بکر ذراعیھا۔ ترجمہ۔ کیا کافی ہے آپکے لئے کہ جب ابوبکر کی لڑکی اپنی باہوں کو ننگی کرے۔ مصنف ہفوات کیا کے لفظ کو اڑا کر خالی کافی ہے پر کفایت کر لیتے ہیں اور اسپر اعتراض بھی وارد کر دیتے ہیں لفظ کیا ایسے موقع پر کئی معنے دیتا ہے کبھی اس کے معنی تردید کے ہوتے ہیں یعنی ایسا نہیں ہے کبھی اسکے معنے سوال کے ہوتے ہیں کیا یہ بات درست ہے؟ اور کبھی اس کے معنی تعریف کے ہوتے ہیں یعنی ایک شخص کسی کی نسبت کوئی بات کہتا ہے یا سمجھتا ہے تو اسپر طنز کرنے کیلئے ایسے الفاظ کہدیئے جاتے ہیں اور کبھی اسکے معنے ایک بات کے اثبات کے بھی ہوتے ہیں یعنی سوال سے مراد کسی امر کا اقرار ہوتا ہے نہ کہ سوال لیکن یہ معنی بعید مجاز کے ہیں اور اسی وقت اسکے یہ معنی کئے جا سکتے ہیں جبکہ اصل معنے یا مجاز قریب کے معنے نہ لئے جا سکیں یا قرینہ ان پر شاہد ہو۔ اس جگہ اسکے معنی حقیقی یا مجاز قریب کے لئے جا سکتے ہیں۔ اور وہی برمحل ہیں۔ پس کوئی وجہ نہیں کہ بات کو پھرا کر کہیں کا کہیں لیجایا جائے۔ بات صاف ہے کہ حضرت زینب استفہام انکاری کے طور پر کہتی ہیں کہ کیا عائشہ رضہ کا اپنی باہوں کو ننگا کر لینا آپ کے لئے کافی ہے؟ یعنے ایسا نہیں ہے۔ یہ تمہید باندھکر وہ آگے اپنا مطلب کہنا چاہتی ہیں جسکے لئے جیساکہ الفاظ حدیث سے ظاہر ہوتا ہے وہ حضرت عائشہ رضہ سے مخاطب ہو کر باتیں کرنے لگی تھیں۔

پس یہ اعتراض ہی بالکل لغو ہے کہ کیا رسول کریم صلعم ایسے تھے یا یہ کہ آپکی بیویاں ایسی گستاخ تھیں۔ جیساکہ میں بیان کر چکا ہوں الفاظ حدیث میں تو اس الزام کی نفی کی گئی ہے پس خود الفاظ حدیث ہی رسول کریم صلعم کو ناواجب محبت سے اور ام المؤمنین کو الزام گستاخی سے بری کر رہے ہیں۔ پھر تعجب ہے مصنف صاحب ہفوات کی عقل پر کہ وہ اس سے الٹا نتیجہ نکال رہے ہیں اور لفظ کیا کو بالکل نظرانداز کر کے اپنا بغض نکالنا چاہتے ہیں۔

اب رہا یہ سوال کہ حضرت عائشہ رضؓ جن سے شطر دین سیکھنے کا حکم تھا بلا اجازت حضرت زینب رضؓ کے گھر کیوں چلی گئیں؟ اسکا جواب یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضؓ ہرگز زینب رضؓ کے گھر میں نہیں گئیں پس حضرت عائشہ رضؓ پر اعتراض ہی فضول ہے۔ اصل الفاظ حدیث کے یہ ہیں کہ ما علمت حتی دخلت علیّ زینب بغیر اذن وھی غضبیٰ ثم قالت یارسول اللہ۔ یعنی مجھے یہ امر نہیں معلوم ہوا حتی کہ زینب میرے گھر میں بغیر اذن کے داخل ہوگئیں اس حال میں کہ وہ غضب میں تھیں۔ پھر کہا یارسول اللہ۔ اس حدیث سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت زینب رضؓ حضرت عائشہ رضؓ کے گھر میں چلی گئیں نہ یہ کہ حضرت عائشہ رضؓ حضرت زینب رضؓ کے گھر میں گئیں۔ مصنف ہفوات کو دھوکا اس سے لگا ہے کہ ابن ماجہ کے بعض حواشی میں غلطی سے اسکے الٹ معنی لکھے گئے ہیں۔ چونکہ خود ان کو تمیز نہ تھی انہوں نے جھٹ ان معنوں کو لیکر اعتراض کر دیا۔ کسی عرب کے سامنے اس حدیث کو رکھکر پوچھو وہ یہی معنے کریگا کہ حضرت زینب رضؓ حضرت عائشہ رضؓ کے گھر گئیں ہیں نہ حضرت عائشہ رضؓ حضرت زینب رضؓ کے گھر۔ کیونکہ ما علمت وھی غضبیٰ اور ثم کے الفاظ دوسرے معنی کرنیکی اجازت ہی نہیں دیتے۔ فقرہ کی بناوٹ پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ داخل ہونے والی زینب رضؓ ہیں نہ کہ عائشہ رضؓ

ابن ماجہ مطبوعہ مصر میں بھی اس حدیث کو اسی طرح لکھا ہے جس طرح میں نے بیان کیا ہے اور حاشیہ سندھی میں لکھا ہے وعند مجیئ زینب ظھر لھا تمام الحقیقۃ۔ یعنی زینب رضؓ کے آنے پر عائشہ رضؓ کو سب حال معلوم ہوا جس سے معلوم ہوا کہ سندھی کے نزدیک بھی اس حدیث کا مطلب یہی ہے کہ زینب رضؓ عائشہ رضؓ کے گھر میں آئی تھیں نہ کہ عائشہ رضؓ زینب رضؓ کے گھر گئی تھیں۔

اسجگہ یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ خواہ زینب رضؓ عائشہ رضؓ کے گھر بلا اجازت گئیں یا عائشہ رضؓ زینب رضؓ کے گھر گئیں بہرحال یہ اعتراض تو قائم رہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک بیوی بلا اذن خلاف شریعت کے طور پر دوسری بیوی کے گھر میں چلی گئیں۔ اسکا جواب یہ ہے کہ یہ اعتراض اس وقت پڑ سکتا ہے جبکہ حقیقت سے آنکھیں بند کر لیجائیں۔ لیکن ان واقعات کو مد نظر رکھکر جنکے ماتحت یہ معاملہ ہوا ہے اعتراض تو پڑتا ہی نہیں یا اسکا وہ وزن نہیں رہتا جو اسکو دیا گیا ہے۔ وہ واقعہ جو اس حدیث میں بیان ہوا ہے اس طرح ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ جو لوگ ہدایا لاتے ہیں وہ اس دن تک انتظار کرتے رہتے ہیں

جس دن کہ حضرت عائشہ رضؓ کے گھر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی باری ہو اور یہ بات ان کو طبعًا ناگوار گذری۔ اسپر انہوں نے مشورہ کرکے حضرت فاطمہ رضؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجا کہ آپ یہ اعلان کردیں کہ جو لوگ ہدایا لاتے ہیں سب بیویوں کی باری میں مساوی طور پر لایا کریں حضرت عائشہ رضؓ کی خصوصیت نہ مدنظر رکھا کریں۔ اس امر کا اعلان اس شخص کی طرف سے جسکے پاس ہدایا آتے ہوں نہائت مخفی طور پر ہدایا لانے کی ترغیب پر بھی مشتمل قرار دیا جاسکتا تھا اسلئے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم جو اخلاق فاضلہ کا نمونہ تھے ایسے اعلان کا کیا جانا کب پسند فرماسکتے تھے۔ آپنے حضرت فاطمہ رضؓ سے صاف کہدیا کہ میں ایسا نہیں کرسکتا۔ چونکہ آپکی بیویاں اس امر کو اور نظر سے دیکھتی تھیں اور اس میں اپنی سبکی خیال کرتی تھیں انہوں نے پھر زور دینا چاہا اور اسیوقت حضرت زینبؓ دوبارہ اس امر کو پیش کرنے کیلئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر تشریف لائیں۔ اور چونکہ اسی وقت حضرت فاطمہ رضؓ اس گھر سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بات کرکے نکلی تھیں انہوں نے اذن لینے کی ضرورت نہیں سمجھی اور خیال کیا کہ اس عرصہ میں کوئی ایسی صورت نہیں پیدا ہوسکتی جس میں مجھے حجاب کی ضرورت ہو۔ پس اسوقت انکا داخل ہونا ایسا ہی ہے جیسے کسی ایسے گھر میں جس میں سے کہ دوسرے لوگ نکل رہے ہوں کوئی دوسرا شخص اسی خیال پر گھس جائے کہ پردہ ہی ہوگا۔

حضرت فاطمہ رضؓ کو جس قدر پردہ رسول کریم صلعم سے ہوسکتا تھا اس سے بہت کم پردہ زینب رضؓ کو تھا جو آپکی بیوی تھیں۔ پس حضرت فاطمہ رضؓ کے آنے کے بعد انکا اس جوش میں جو اس واقعہ سے ان کی طبیعت میں پیدا ہوگیا تھا بلا اذن اندر چلے جانا ہرگز اس نظر سے نہیں دیکھا جاسکتا جس نظر سے مصنف ہفوات کی آنکھ نے انسے دیکھا ہے۔ زیادہ سے زیادہ وہ ایک اجتہادی غلطی تھی اور بس۔

حضرت عائشہؓ کا حبشیوں کا ناچ دیکھنا

اسکے بعد مصنف ہفوات نے یہ اعتراض کیا ہے کہ بخاری کتاب الصلوٰۃ اور کتاب العیدین اور کتاب الجہاد کی بعض احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضؓ کو حبشیوں کا ناچ دکھایا۔ اور یہ کہ آپکے گھر میں بعض لڑکیوں نے شعر پڑھے ہے مصنف

ہفوات اسپر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ (۱) حضرت عائشہ رضؓ نے ناچ رسول پر نظر کیوں ڈالی؟ (۲) رسول کریم صلعم نے منع کرنا تو الگ رہا خود ان کو ناچ کیوں دکھایا؟ (۳) باوجود حضرت ابوبکرؓ کے شعر پڑھنے سے اور حضرت عمرؓ کے ناچ سے روکنے کے آپ نہ سمجھے کہ یہ منع ہے اور فرمایا کہ ناچے جاؤ چونکہ یہ امور آپکی شان کے خلاف ہیں معلوم ہوا کہ یہ احادیث باطل ہیں؛

یہ سوال کہ گانے سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیوں منع نہیں فرمایا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ شعر خوش الحانی سے پڑھنا اسلام میں جائز ہے، اور جب شریعت کے باقی احکام کو جو پردہ اور فحش سے اجتناب کرنیکے متعلق ہیں مدنظر رکھکر کوئی عورت یا مرد شعر پڑھے تو اسے شریعت باز نہیں رکھتی نہ کہیں قرآن کریم میں نہ حدیث میں یہ مذکور ہے کہ شعر کا خوش الحانی سے پڑھنا حرام اور ممنوع ہے۔ پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو دین فطرت لیکر آئے تھے اس امر سے کیوں روکتے؟ حضرت ابوبکرؓ نے جو روکا تو یہ انکا اجتہاد تھا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چونکہ انکو روکنے سے منع فرمادیا تھا معلوم ہوا کہ انکا یہ اجتہاد غلط تھا پس جب شارع نبی ایک امر کو جائز قرار دیتا ہے تو کسی شخص کا حق نہیں کہ عورت یا مرد کو خوش الحانی سے شعر پڑھنے سے روکے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ شریعت کے پردہ کے حکم پر عمل کیا جائے اور فحش کلامی سے یا فحش کیطرف توجہ دلانیوالے جذبات سے پرہیز کیا جائے۔ اگر قومی ترانے یا وعظ ونیکی کی باتیں یا مناظر قدرت کی تشریح یا قومی جذبات کے اُبھارنے کے اشعار ہوں یا جنگوں کے واقعات یا تاریخی امور ان میں بیان ہوں تو ایسے اشعار کا پڑھنا یا سننا نہ صرف یہ کہ ممنوع نہیں بلکہ بعض اوقات ضروری اور لازمی ہے۔ اور فطرت کے صحیح اور اعلیٰ مطالبہ کا پورا کرنا ہے۔ اور جو شخص اس امر کو ناجائز قرار دیتا یا اسے بُرا مناتا ہے وہ جاہل مطلق ہے اور مذہب اور فطرت کے تعلق اور شریعت کے اسرار سے قطعاً ناواقف ہے اور پھر جو شخص رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل کو دیکھکر بھی یہ کہتا ہے کہ اگر آپنے اس کی اجازت دی ہو تو اس سے آپ پر اعتراض آتا ہے اس کی مثال اس پٹھان کی سی ہے جسکی نسبت پہلے لکھا جا چکا ہے کہ اسنے حدیث میں یہ پڑھکر کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز میں حرکت کی تھی کہدیا تھا کہ خو محمد صاحب کا نماز ٹوٹ گیا۔ کیونکہ کنز میں لکھا ہے کہ حرکت سے نماز ٹوٹ جاتی ہے؛ نادان مصنف ہفوات بھی اس پٹھان کی طرح نہیں جانتا کہ شریعت کے احکام کا بیان کرنا

رسول کا کام ہے نہ مصنف ہفوات جیسے لوگوں کا جو کوئیں کے مینڈک کی طرح ایک محدود دائرے
میں چکر لگاتے رہتے ہیں اور قانون قدرت کی وسعت اور احکام شریعت کی غرض اور غائت
سے ایسے ہی نابلد ہیں جیسے کہ ایک جانور ایجادات انسانیہ سے۔ خدا کے رسول نے جب ایک کام
کر کے دکھا دیا تو اسکے خلاف جو مسئلہ کوئی بیان کرتا ہے وہ لغو اور بیہودہ ہے اور اس سے اس مسئلہ
کے بیان کرنیوالے کی جہالت اور حماقت سے زیادہ اور کچھ ثابت نہیں ہوتا سوائے اس صورت کے کہ
اس سے نادانستہ ایسا مسئلہ بیان ہوا ہو جو اقوال و افعال رسالت مآب کے خلاف ہو۔ مصنف
ہفوات کو یاد رکھنا چاہئے کہ خوش الحانی سے شعر پڑھنا یا سننا ایک فطرتی تقاضا ہے اور بچپن
سے اسکی لذت روح انسانی میں رکھی گئی ہے اور اسلام دین الفطرت ہے۔ خدا کا کلام اور اس کا فعل
مخالف نہیں ہو سکتے۔ جس خدا نے یہ جذبہ انسان کے اندر رکھا ہے وہ اس جذبہ کے صحیح استعمال سے
اسے روک نہیں سکتا تھا۔

باقی رہا دوسرا سوال کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رض کو حبشیوں کا ناچ کیوں
دکھایا اور غیر محرم پر نظر کیوں ڈلوائی؟ اسکا جواب یہ ہے کہ یہ دونوں اعتراضات بالکل باطل
اور جھوٹے ہیں۔ نہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رض کو ناچ دکھایا ہے اور نہ غیر محرم
پر نظر ڈلوائی ہے۔ اور مصنف ہفوات نے دیدہ و دانستہ یہ اعتراض کیا ہے۔ کیونکہ جو احادیث انہوں نے
نقل کی ہیں وہی ان اعتراضات کو رد کر رہی ہیں۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔ وکان یوم عید
یلعب السودان بالدرق والحراب فاما سألت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واما
قال تشتہین تنظرین فقلت نعم فاقامنی وراءہ خدی علی خدہ ویقول دونکم یا بنی
ارفدۃ حتی اذا مللت قال حسبک قلت نعم قال فاذہبی۔ یعنی عید کا دن تھا اور حبشی لوگ
ڈھالوں اور برچھوں سے کرتب کر رہے تھے مجھے یاد نہیں کہ میں نے خود کہا یا رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ
کیا تو دیکھنا چاہتی ہے؟ اسپر عائشہ رض فرماتی ہیں کہ انہوں نے کہا کہ ہاں۔ پس آپ نے مجھے اپنے پیچھے کھڑا
کر لیا اور آپکی گال کے ساتھ میری گال لگی ہوئی تھی پھر آپنے فرمایا اپنا کام کئے جاؤ اے بنو ارفدہ
یہاں تک کہ جب میں ملول ہو گئی آپنے فرمایا بس؟ میں نے کہا ہاں۔ آپنے فرمایا اچھا جاؤ۔
حدیث کے الفاظ واضح ہیں اسکا مطلب ظاہر ہے اس میں کسی اندر کے دربار کے ناچ کا ذکر

نہیں جنگی مشق کا ذکر ہے جو مسجد کے صحن میں صحابۂ رسول کریم صلعم کر رہے تھے۔ پس اسپر یہ اعتراض کرنا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیوی کو ناچ دکھایا۔ پس چاہیئے کہ مسلمان تھیٹروں اور ناچ گھروں میں اپنی عورتوں کو لیجایا کریں اول درجہ کی بے حیائی اور شرارت ہے اور ایسا انسان جو جنگ کے فنون کو ناچ گھروں کے اعمال سے تشبیہ دیتا ہے یا تو خرد ماغ ہے جس کی عقل میں ادنیٰ سے ادنیٰ بات بھی نہیں آسکتی یا بے شرمی و بیحیائی میں اس قدر بڑھ گیا ہو کہ اس سے بڑھکر کسی بے شرمی کا خیال کرنا بھی مشکل ہے۔ کیا فنون حرب کا استعمال ناچ ہوتا ہے۔ تو کیا جنگ کے موقع پر آگے پیچھے حرکت کرنا ناچ ہے؟ اور حضرت علی رضؓ جنہوں نے سب عمر جنگ میں گذاری وہ ہمیشہ ناچ گھروں کو ہی زینت دیتے رہے تھے؟ اگر کہو کہ وہ تو جنگ کے موقع پر اس فن کا استعمال کرتے تھے نہ کہ بے موقع۔ تو میں پوچھتا ہوں کہ کیا کوئی فن بلا سیکھے کے بھی آجاتا ہے؟ آخر پہلے تلوار پکڑنی اور پیترے بدلنے انہوں نے سیکھے ہونگے نیزے کا وار اور ڈھال کا استعمال کرنے کی مشق کی ہوگی۔ تبھی آپ جنگ میں ان چیزوں کو استعمال کرسکتے ہونگے۔ تو کیا ان مشق کے ایام میں آپ ناچا کرتے تھے؟ وہ فن جو اعلیٰ درجہ کے شریف فنون میں سے ہے جسکے ساتھ قوموں کی عزت اور ترقی وابستہ ہے اسکو ناچ قرار دینا سوائے بے شرموں اور بزدلوں کے کسی کا کام نہیں۔ اور اسکو ناچ قرار دینا گویا خدا کے انبیاء اور اولیاء کو ایکٹر قرار دینا ہے۔ کیونکہ بہت سے انبیاء اور اولیاء فنون حرب میں ماہر تھے اور اُن کو استعمال کرتے تھے۔

مصنف ہفوات نے اس امر سے بالکل آنکھیں بند کرلی ہیں کہ جسقدر زندہ قومیں ہیں وہ وقتاً فوقتاً فوجی کرتب دکھاتی رہتی ہیں جس سے ان کی ایک طرف تو یہ غرض ہوتی ہے کہ سپاہیوں کے ہاتھ سست نہ ہوجائیں اور ان کی مشق جاتی نہ رہے۔ دوسری نئی پود کے دل میں جنگی ولولوں کا پیدا کرنا اور ان کے دلوں میں اپنی ذمہ داری کا شعور پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے۔ تیسرے اس فطرتی تقاضا کا پورا کرنا مطلوب ہوتا ہے جو انسان کی طبیعت میں حصول فرحت و سرور کی خواہش کے رنگ میں ازل سے ودیعت کیا گیا ہے۔ جو لوگ نادان اور بے وقوف ہوتے ہیں وہ اس خواہش کو لغو اور بیہودہ طریق پر پورا کرتے ہیں۔ لیکن نیک اور صالح لوگ اس خواہش کو ایسے رنگ میں پورا کرتے ہیں کہ خوشی کا سامان بھی بہم پہونچ جاتا ہے اور نیک نتائج بھی پیدا

ہو جاتے ہیں۔ پس بیوقوف ہے وہ شخص جو ان مشقوں اور مظاہروں کو ناچ گھروں والی ناچوں سے تشبیہ دیتا ہے اور ان کو اخلاق کے خلاف قرار دیتا ہے۔ درحقیقت کسی قوم کی مُردنی کی اس سے بڑھکر کوئی علامت نہیں کہ اسکے افراد فنون جنگ سے نفرت کرنے لگیں اور انکو شان کے خلاف سمجھنے لگیں اور جس خاندان سے مصنف ہفوات اپنی آپکو منسوب کرتے ہیں اسکی ہلاکت کی ایک بہت بڑی وجہ یہی تھی کہ وہ عیش پرست اور نکما ہوگیا تھا اور مجھے تعجب ہے کہ باوجود اس سخت گرفت کے جو مصنف ہفوات کے خاندان پر اللہ تعالیٰ نے کی ہے کہ ان کی حکومت چھین لی ان کا مال چھین لیا ہے انکی عزت چھین لی ہے ابھی تک ان کے اندر ابھی بیگمات کے خیالات جوش مار رہے ہیں جنہوں نے دہلی کی جنگ کے موقع پر بادشاہ کو رو رو کر مجبور کر دیا تھا کہ وہ ان کے مکان کے سامنے سے جو بہترین موقع توپ چلانیکا تھا توپ کو ہٹا لے اور اس طرح اپنی بزدلی کا اظہار کر کے اور اسکے مطابق بادشاہ سے عمل کرا کے شاہی خاندان اور دہلی کی حکومت کا تختہ الٹ دیا تھا۔ اگر شاہی خاندان کی عورتیں فنون جنگ کو دیکھنے کی عادی ہوتیں اگر ان کو جنگی مظاہرات کا معائنہ کرنیکا موقع دیا جاتا اگر وہ اپنے زمانہ کے ہتھیاروں کے استعمال کو دیکھ دیکھکر ان کی ہیبت کو دل سے نکال چکی ہوتیں تو ایسی بزدلانہ حرکات ان سے کیوں ظاہر ہوتیں۔ اور اگر بادشاہ فنون جنگ کے ماہر ہوتے اور ان کی عمر اس قسم کے کاموں میں بسر ہوتی تو وہ جنگ اور اسکے نتیجہ سے آگاہ ہوتے تو وہ بیگم کی خواہش کو کیوں مانتے؟ وہ اسکی موت کو اسکی خواہش کے پورا کرنے سے ہزار درجہ بہتر سمجھتے کیونکہ ملک کی عزت اور اسکے وقار کے مقابلہ میں کسی فرد کی خواہ وہ بادشاہ کی چہیتی بیوی ہی کیوں نہ ہو کیا قدر ہوتی ہے؟ —

لوگ کہتے ہیں کہ بیگم نے انگریزوں سے ساز باز کیا ہوا تھا اور وہ مخلصانہ کام نہیں کرتی تھی مگر میں کہتا ہوں اگر جنگی مظاہرات ہوتے رہتے اور توپیں دغتی رہتیں اور ان کے دیکھنے اور ان میں حصہ لینے کا بیگمات کو موقع ملتا رہتا تو بیگم یہ بہانہ کیونکر بنا سکتی تھیں کیا بادشاہ اور دوسرے لوگ ان کو یہ نہ کہتے کہ یہ بات تو ہمیشہ تم دیکھتی رہی ہو آج یہ نیا ڈر کہاں سے پیدا ہو گیا ہے؟ -

اس میں کوئی شک نہیں کہ عورت جنگ میں حصہ لینے کے لئے نہیں پیدا کی گئی لیکن عورت کا فنون حرب سے واقف ہونا نہایت ضروری ہے ورنہ اگر اسکا دل تلوار کی چمک سے کانپ جاتا ہے

اور اسکا خون بندوق یا توپ کی آواز کو سنکر خشک ہو جاتا ہے تو وہ اپنے بچوں کو خوشی سے میدان جنگ میں جانیکی اجازت کب دے سکتی ہے؟ اور ان کے دل سے آئے چھوٹے خوف کو کب دور کر سکتی ہے؟ وہی اور صرف وہی عورت جورات اور دن اپنے زمانہ کے ہتھیاروں کی نمائش کو دیکھتی رہی ہے اور اسکے دل سے ان کا خوف دور ہو جاتا ہے اور وہ انکو ایک کھلونا سمجھنے لگتی ہے اپنے بچوں کو اس ذمہ داری کے اٹھانے کے لئے تیار کر سکتی ہے جو اپنی مذہب اور اپنے ملک کی طرف سے ان پر عائد ہونیوالی ہے۔ اور اسمیں کیا شبہ ہے کہ جنگ سے قریب ترین نظارہ مصنوعی جنگ کا ہوتا ہے۔ جس میں دیکھنے والا بسا اوقات یہ خیال کرتا ہے کہ اب ایک شخص دوسرے کے وار کے آگے زخمی ہو کر گر جائیگا اور ہتھیار کا حقیقی رعب اس سے قایم ہوتا ہے۔

غرض جنگ کے کرتب کروانے یا کرنے ناچ کروانا یا کرنا نہیں ہے نہ انکا عورتوں کو دکھانا ناچ دکھانا ہے بلکہ جنگ کے کرتبوں کی مشق کرانا مذہبی فرض ہے اور ملک کا حق ہے اور زندگی کا نشان ہے اور عورتوں کو ان فنون کے دیکھنے کا موقع دینا ایک قومی ذمہ داری ہے جس کی طرف سے بے توجہی غداری ہے۔ بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ اگر ممکن ہو سکے تو ان کو فنون جنگ سکھانے چاہئیں جیسا کہ عرب لوگ سکھاتے تھے تاکہ وقت پر وہ اپنی عصمت اور عزت کی حفاظت کر سکیں اور مصیبت کی ساعت میں اپنے مردوں اور اپنے بھائیوں کا ہاتھ بٹا سکیں۔ اسلام کی تاریخ ان مثالوں سے پُر ہے کہ عورتوں نے جنگ میں خطرناک اوقات میں جب اور لشکر میسر نہ آسکتے تھے مردوں کا ہاتھ بٹایا۔ اور ان کے ساتھ فتح میں شریک ہوئیں۔ ان کے حالات ہماری رگوں میں فخر کی لہر پیدا کر دیتے ہیں اور ان کے کارنامے ہماری ہمتوں کو بلند و بالا کر دیتے ہیں اور مصنف امہات ہمیں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ وہ بچنیاں تھیں اور قوم اور ملک کیلئے ننگ وہ غیر مردوں کا چہرہ دیکھنے والی تھیں اور حیا اور شرم سے عاری۔ مگر میں کہتا ہوں یہ ننگ ہماری لئے ستر کا موجب ہے، اور یہ عار ہماری لئے عزت کا باعث ہے تیری عزت اور تیری حیا تیرے لئے ہو کہ ہمارا لئے وہ عار ہے۔ لئے موجب ننگ و عار ہے۔

مصنف امہات کا یہ اعتراض کہ کیا حضرت عائشہ رضہ نے غیر محرم پر نظر ڈالی اور رسول کریم صلعم نے نظر ڈلوائی ایسا ہی بیوقوفی کا سوال ہے جیسا کہ پہلا۔ غیر محرم پر نظر نہ ڈالنے کے معنی

نہیں ہیں کہ کسی صورت اور کسی غرض سے غیر محرم کے کسی حصہ پر نظر ڈالنی منع ہے۔ اگر شریعت اسلامیہ کا یہ مسئلہ ہوتا تو عورتوں کو چار دیواری سے باہر نکلنے کی اجازت نہ ہوتی اور مکان بھی بند دریچوں کے بنائے جاتے جس قسم کے کہ ظالم بادشاہ قید خانے تیار کراتے ہیں۔ مصنف ہفوات کو یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ عورت بھی اسی قسم کی انسان ہے جس قسم کا کہ مرد ہے اور اسکی طبعی ضروریات بھی مرد ہی کی طرح ہیں۔ خدا کا طبعی قانون دونوں پر یکساں اثر کر رہا ہے اور وہ قانون صحت کی درستی اور جسم کی مضبوطی کیلئے اس امر کا مقتضی ہے کہ کھلی ہوا میں انسان پھرے اور روزانہ کافی مقدار میں نقل و حرکت کرے اور محدود دائرہ میں بند ہونیکا خیال اسکے اعصاب میں کمزوری نہ پیدا کرے جس خدا نے عورت کو ان قوتوں اور ان تقاضوں کیساتھ پیدا کیا ہے اور جس خدا نے اسکا ایک ہی علاج مقرر فرمایا ہے اسکا کلام عورت کو اس ایک ہی علاج سے محروم نہیں کر سکتا سزا ایک آدمی کو دی جا سکتی ہے دو کو دی جا سکتی ہے لیکن قوم کی قوم کو نسلاً بعد نسلٍ قید میں نہیں رکھا جا سکتا۔ آخر فطرت بغاوت کریگی اور قید خانہ کی دیواروں کو توڑ کر رکھدیگی۔

شریعت کا مقرر کردہ پردہ فطرت کے خلاف نہیں ہے اسکو جو لوگ توڑنے کی کوشش کرتے ہیں وہ فطرت کے تقاضے کو نہیں بلکہ ہوا و ہوس کے تقاضے اور عیش پرستی کے جذبات کو پورا کرنے کیلئے ایسا کرتے ہیں۔ فطرت کے تقاضے قانون قدرت کے اندر اپنے نشان رکھتے ہیں اور ان کا توڑنا خدا کی کل کائنات کو مخالفت پر کھڑا کر دیتا ہے لیکن عورت کا بے محابا ہر مرد کے سامنے ہونا اسکے ساتھ بے تکلف ہونا اور علیحدہ ہو جانا کسی ایک قانون قدرت کو بھی مخالفت پر نہیں آمادہ کرتا بلکہ الٹا انسان کو اسکے اعلیٰ مرتبہ سے گرا کر حیوانی تقاضوں اور جذبات کے گڑھے میں دھکیل دیتا ہے پس اسپر اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اس سے زیادہ پردہ کرانا یا اسکی خواہش کرنی خدا کے حکم کی اتباع نہیں ہے بلکہ اسکا مقابلہ ہے اور صرف ایک عارضی اور زیادہ اہم ضرورت کیلئے اسکو جاری کیا جا سکتا ہے جس طرح کہ ایک طبیب ایک بیمار کو چلنے پھرنے سے جو فطری تقاضے ہیں روکدیتا ہے۔

جبکہ شریعت نے عورت کو باہر نکلنے کی اجازت دی ہے اور صرف منہ کا ایک حصہ اور بدن کو ڈھانپنے کا حکم دیا ہے اور ہاتھ اور پاؤں اور دوسری چیزیں جو ایسے موقع پر ظاہر ہو ہی جاتی ہیں

ان کو ظاہر کر دینے کی اجازت دی ہے تو یہ ضروری بات ہے کہ ایک عورت جو گھر سے باہر اس حالت میں نکلے گی اسکی نظر مردوں کے جسم کے بہت سے حصوں پر اسی طرح پڑے گی جس طرح کہ عورت کے بعض حصوں پر مرد کی پڑتی ہے۔ غض بصر کے حکم نے یہ بتا دیا ہے کہ اصل چیز جو پردہ کی جان ہے دونوں کی نظروں کو ملنے سے بچانا ہے اور جسم کا وہ حصہ جس پر نگاہ ڈالتے ہوئے آنکھیں ملنے سے رہ ہی نہیں سکتیں یا اس امر کی احتیاط نہایت مشکل ہو جاتی ہے وہ چہرہ ہے۔ بقیہ جسم کو جبکہ وہ مناسب کپڑوں سے ڈھکا ہوا ہو نہ چھپانے کی ضرورت ہے نہ اسے چھپایا جا سکتا ہے جبتک کہ عورتیں بازاروں اور گلیوں میں پھرنا نہ چھوڑ دیں یا قناتیں تان کر وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ کا سفر نہ کریں لیکن کیا یہ ہر عورت کیلئے ممکن ہے؟

امرا کی عورتیں تو اپنے مکانوں کی وسیع چار دیواریوں میں پھر بھی سکتی ہیں۔ غربا کی عورتیں کہاں جائیں اور متوسط طبقہ کی عورتیں کس طرح گذارہ کریں؟ مگر امرا کی عورتوں کو بھی میل ملاقات کیلئے ایک گھر سے دوسرے گھر کی طرف جانا پڑتا ہے۔ جبتک انکی تمام زندگی کو ایک سخت قید کی ہم شکل نہ بنا دیا جائے اسوقت تک انکو بھی کبھی نہ کبھی باہر نکلنا ہوگا۔ اور انکی نظر بھی لازماً گلیوں اور سڑکوں پہ پھرنے والے اور برآمدوں اور سٹیشنوں اور گاڑیوں پر بیٹھنے والے لوگوں کے بعض حصہ جسم پر پڑیگی سوائے اس صورت کے کہ گھر سے نکلتے ہی ان کی آنکھوں پر پٹیاں باندھ دی جائیں۔ جو عورت یہ کہتی ہے کہ باوجود باہر نکلنے کے اسکی نظر کسی مرد کے کسی حصہ جسم پر کبھی نہیں پڑی وہ جھوٹی ہے۔ اور جو مرد یہ امید رکھتا ہے کہ اسکی بیوی نے کسی مرد کو مذکورہ بالا طریق پر کبھی نہیں دیکھا وہ پاگل ہے۔

پردہ مرد اور عورت کیلئے برابر ہے۔ جب عورت باہر برقع یا چادر اوڑھ کر نکلتی ہے تو کیا مرد کو اسکے پاؤں اور اسکی چال اور اسکا قد اور اسکے ہاتھوں کی حرکت اور ایسی ہی اور کئی چیزیں نظر نہیں آتیں؟ اور کیا ان کا پردہ ممکن ہے؟ اگر عورت کے بعض حصے مرد کو ضرور نظر آتے ہیں اور ان کا پردہ ناممکن ہے اور اس سے بھی زیادہ بعض حصے ایسے ہیں جن کا پردہ غریبوں کے لئے ناممکن ہے تو پھر اگر اسی قدر حصہ یعنی مرد کا ڈھکا ہوا جسم اور اسکی حرکات عورت کو نظر آتی ہیں تو یہ امر اسکے لئے ناجائز کیونکر ہو گیا؟

پردہ مرد اور عورت کیلئے برابر ہے جیسے عورت کیلئے پردہ ہے ایسے ہی مرد کیلئے بعض لوگوں نے یہ سمجھکر کہ پردہ صرف عورت کیلئے ہے پردہ کے مسئلہ کو عقل کی روشنی میں مسائل کی چھان بین کرنیوالے لوگوں کیلئے لاینحل عقدہ بنا دیا ہے۔ اگر عورت کو چادر اوڑھکر باہر نکلنے کا حکم دیا گیا ہے تو اسکی وجہ یہ نہیں ہے کہ پردہ کا حکم صرف اسی کیلئے ہے بلکہ اسکی وجہ یہ ہے کہ مرد کا اصل دائرہ عمل گھر سے باہر ہے اور عورت کا اصل دائرہ عمل گھر کی چاردیواری ہے۔ پس چونکہ عورت مرد کے اصل دائرہ عمل میں جاتی ہے وہ چادر اوڑھ لیتی ہے اور مرد چونکہ اپنے اصل دائرہ عمل میں ہوتا ہے وہ کھلا پھرتا ہے۔ اگر اسکو اپنے دائرہ عمل میں چادر اوڑھنے کا حکم دیا جاتا تو چونکہ اس کا وہاں ہر وقت کا کام ہے اسکے لئے کام مشکل ہو جاتا اور وہ تھوڑے ہی دنوں میں اپنے مرتبہ عمل سے گر جاتا جس طرح کہ اگر عورت کو اسکے دائرہ عمل یعنے گھر کی چاردیواری میں چادر اوڑھکر کام کرنیکا حکم دیا جائے تو وہ گھبرا جائے اور کام نہ کرسکے اس فرق کے مقابلہ میں مرد کو یہ حکم ہے کہ وہ عورت کے دائرہ عمل میں بالکل گھسے ہی نہیں اور اسکو آزادی سے اپنا کام کرنے دے پس حکم برابر ہے عورت اگر مرد کے دائرہ عمل میں گھستی ہے تو اسکے لئے حکم ہے کہ چادر اوڑھ لے اور مرد اگر عورت کے دائرہ عمل میں جانا چاہتا ہے تو اسے حکم ہے کہ بلا عورت کی اجازت کے ایسا نہ کرے اور مرد کیلئے یہ سختی بھی عورت کی رعایت کے طور پر نہیں بلکہ اسلئے ہے کہ مرد کے دائرہ عمل میں عورت کے بھی حقوق ہیں اور عورت کے دائرہ عمل سے مرد کے حقوق وابستہ نہیں۔ پس عورت کو اجازت کی ضرورت نہیں رکھی بلکہ صرف اوٹ کر لینا کافی رکھا ہے اور عورت کے دائرہ عمل میں مرد کے بلا اجازت داخلہ کو روک دیا ہے پردہ کے مسئلہ کو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد حضرت عائشہ رضہ کے واقعہ کو سمجھ لینا کچھ بھی مشکل نہیں حضرت عائشہ رضہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اوٹ میں کھڑے ہوکر ان فوجی کرتبوں کو دیکھ رہی تھیں جنکو مصنف ہفوات اپنی نادانی سے ناچ گھروں کے ناچ سے تشبیہ دیتا ہے پس ان کا چہرہ تو اوٹ میں تھا اور وہ لوگ جو کرتب کر رہے تھے ہاتھوں سے یہ کام کر رہے تھے ان کے چہرہ پر نظر ڈالے بغیر اور آنکھ سے آنکھ ملائے بغیر آپ ان کے فنون کو دیکھ سکتی تھیں پس یہ بھی شریعت کے خلاف بات نہ تھی اس طرح ضروری اور علمی امور کو دیکھنا نہ صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ جیسا کہ میں پہلے ثابت کر آیا ہوں۔ ضروری ہے کہ

حضرت فاطمہ رضہ کی نسبت روایات شیعہ اور سنی سے ثابت ہے کہ وہ بھی گھر سے باہر نکلتی تھیں اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھی تشریف لاتی تھیں اور حضرت ابوبکر رضہ سے فدک کا مطالبہ کرنے بھی تشریف لے گئی تھیں اور کہیں تاریخ سے ثابت نہیں ہوتا کہ اسوقت قناتیں کھینچکر پردہ کر دیا جاتا تھا یا یہ کہ مردوں کو رستہ چلنے سے روکدیا جاتا تھا ایسے اوقات میں لازماً انکی نظر بھی گلیوں میں چلنے والے مردوں کے بعض حصص پر پڑتی ہوگی جس طرح کہ گلیوں میں چلنے والے مردوں کی نظر آپکے ایسے حصص پر جو چھپائے نہیں جاسکتے پڑتی تھی۔ پس جو امور کہ خود ان لوگوں سے سرزد ہوتے رہے ہیں جنکو کہ آپ لوگ بھی بزرگ سمجھتے ہیں۔ ان پر اعتراض کرنا حد درجہ کی ڈھٹائی نہیں تو اور کیا ہے؟ حضرت عائشہ رضہ کا صرف اس قدر قصور ہے کہ جس بات کو بہت سے لوگ اپنی منافقت کے پردہ میں چھپانے کی کوشش کرتے ہیں حضرت عائشہ رضہ اسکو مومنانہ سادگی سے بیان کر دیتی تھیں اور یہ قصور عقلمندوں کے نزدیک قصور نہیں۔ بلکہ قابل فخر جرأت ہے۔

حضرت علی رضہ کی محبت میں رسول کریمؐ کا انحراف حق سے

ایک اعتراض مصنف ہفوات نے یہ کیا ہے کہ تاریخ بغداد اور شرح نہج البلاغت معتزلی میں لکھا ہے کہ عبداللہ بن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضہ کے پاس ایک دفعہ ایک صاع کھجور کا ٹوکرا پڑا تھا اور آپ اس میں سے کھا رہے تھے میں جو گیا تو مجھے بھی کہا کہ کھاؤ۔ میں نے ایک کھجور اٹھائی اور حضرت عمر رضہ نے سب کھجوریں کھالیں اور ایک مٹکا پانی کی پی اور بار بار شکر خدا کا کرنے لگے۔ پھر مجھ سے پوچھا کہ کہاں سے آئے ہو؟ میں نے کہا مسجد سے حضرت عمر رضہ نے پوچھا تمہارے عمزاد برادر کیا کرتے ہیں؟ میں نے کہا اپنے ہم سنوں میں کھیلتے ہوں گے (یعنے عبداللہ بن جعفرؓ) انہوں نے کہا نہیں میں تمہارے بزرگ اہل بیت (یعنی علیؓ) کو پوچھتا ہوں؟ میں نے کہا وہ ایک باغ میں اجرت پر پانی بھرنے جاتے ہیں۔ اور قرآن کی تلاوت کرتے جاتے ہیں۔

اسکے آگے مصنف ہفوات نے ان کتب کی عربی عبارت یوں درج کی ہے۔ قال یا عبداللہ علیک دماء البدن ان کتمتنہا ھل بقی فی نفسہ شیء من امر الخلافۃ قلت نعم

وازیدك سئلت ابی عما یدّعیه فقال صدق فقال عمر لقد کان من رسول اللہ من امر ذرو من قول لایثبت حجۃ ولا یقطع عذرا ولقد کان یزیغ فی امرہ وقتاما ولقد اراد فی مرضہ ان یصرح باسمہ فمنعت من ذلك اشفاقا وحیطۃ علی الاسلام ورب ھذہ البنیۃ لا تجتمع علیہ قریش ابدا ولو ولیھا لا انتقضت علیہ العرب من اقطارھا فعلم رسول اللہ انی علمت ما فی نفسہ فامسك وابی اللہ الا امضاء ما حتم۔ اس کا ترجمہ ان کے اپنے الفاظ میں یوں ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا اے عبداللہ تم پر اونٹوں کی قربانی فرض ہو جائے جو تم چھپاؤ۔ سچ کہو کیا علیؓ کے دل میں اب بھی ادعائے خلافت ہے؟ بیٹے کہا ہاں بلکہ میں اس سے زیادہ بتاؤں کہ میں نے اپنے باپ سے بھی یہ بات دریافت کی تو انہوں نے فرمایا کہ علیؓ کا دعوٰے سچا ہے۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ آنحضرتؐ سے علیؓ کے باب میں چند بار ایسے کلمات نکلے ہیں کہ وہ ثابت نہیں ہوتے اور نہ اُن سے حجت قطع ہوتی ہے اور محبت کی سبب ہے جو اُن کو علیؓ سے تھی اور آنحضرتؐ نے اپنے مرض موت میں حق سے باطل کی طرف میل کرنا چاہا تھا کہ نام علیؓ کی صراحت کردیں لیکن خدا کی قسم میں نے شفقت اُمت اور محبت اسلام کے سبب سے آنحضرتؐ کو منع کیا کیونکہ قریش خلافت علیؓ پر اتفاق نہ کرتے اگر وہ خلیفہ ہو جاتے تو اطراف عرب میں (یعنی مہاجرین قریش) شورش کرتے۔ پس آنحضرتؐ نے جان لیا کہ میں اس بھید کو سمجھ گیا جو بات آنحضرتؐ کے دل میں تھی بایں وجہ آنحضرتؐ ساکت ہو گئے اور نام علیؓ کی صراحت نہ کر سکے اور اللہ تعالےٰ کو جو منظور تھا وہ حکم جاری ہوا۔

اور اس سے نتیجہ یہ نکالا ہے کہ (۱) کیا رسول خدا علیؓ کی محبت میں ایسے گرفتار تھے کہ معاذ اللہ حق سے باطل کی طرف میل کر جاتے تھے (۲) اور ایسے کوتہ عقل (نعوذ باللہ) کہ جو حضرت عمرؓ کو سوجھتی تھی وہ رسول اللہؐ کو نہ سوجھتی تھی (۳) پھر حضرت عمرؓ کو تو رسول اللہؐ اور آپکی اُمت پر شفقت مگر خود رسول اللہؐ کو اپنی اُمت پر شفقت نہو (۴) حضرت عمرؓ کو گستاخ و بے ادب ثابت کر کے ان کے ایمان کی نفی کی گئی ہے۔

پیشتر اسکے کہ میں ان اعتراضات کا جواب دوں۔ اوّل تو میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ترجمہ میں صاحب مصنفہ نے خیانت سے کام لیا ہے پہلی خیانت تو یہ ہے کہ لقد کان من رسول اللہ

من امر ذرو من قول لا یثبت حجۃ کا ترجمہ مصنف نے یہ کیا ہے کہ آنحضرت صلعم سے علی رضؓ کے باب میں چند با ایسے کلمات نکلے ہیں کہ وہ ثابت نہیں ہوتے جس کے یہ معنے بنتے ہیں کہ گو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کے حق میں بعض باتیں فرمائی ہیں لیکن وہ غلط ہیں حالانکہ اصل عبارت کے یہ معنے ہیں کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ایسی باتیں بیان کی جاتی ہیں جو محض اشارات کہی جا سکتی ہیں یا عبارتوں کے ٹکڑے ہیں۔ لیکن ان سے دلیل نہیں پکڑی جا سکتی کیونکہ وہ باتیں واضح نہیں ہیں۔ ذرو من قول کے معنے یا حصۂ کلام یا اشارہ کے ہوتے ہیں اسی طرح لا یثبت حجۃ کے یہ معنے نہیں کہ وہ کلمات غلط ہیں بلکہ یہ کہ وہ ایسے واضح نہیں ہیں کہ ان سے دلیل پکڑی جا سکے۔

دوسری خیانت مصنف کی یہ ہے کہ انہوں نے ولو ولیھا لا انقضت علیہ العرب من اطرافھا کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ اگر وہ خلیفہ ہو جاتے تو اطراف عرب میں (یعنے مہاجرین قریش) شورش کر لیتے۔ گویا حضرت عمر رضؓ نے یہ فرمایا تھا کہ اگر علی رضؓ کو رسول کریم صلعم خلیفہ مقرر کر دیتے تو مہاجرین اُنکا مقابلہ کرتے اور سارے عرب میں شور ڈال دیتے۔ حالانکہ یہ ترجمہ بالکل غلط ہے۔ اس عبارت کا ترجمہ یہ ہے کہ اگر علی رضؓ خلیفہ ہو جائیں تو عرب لوگ چاروں طرف سے ان کی مخالفت شروع کر دینگے۔ اور اس میں مہاجرین کی مخالفت یا ان کی شورش کا اشارہ بھی نہیں۔ اگر کہا جائے کہ عرب میں مہاجرین بھی شامل تھے تو اسکا جواب یہ ہے کہ اگر اس طرح عرب کے لفظ کے عام معنے کرتے ہیں تو پھر عرب میں حضرت علی رضؓ کے اپنے رشتہ دار بھی اور تمام بنو ہاشم اور بنو مطلب بھی شامل تھے۔ مگر یہ کوئی نہیں کہتا کہ اس بات کا یہ مطلب تھا کہ حضرت عباس رضؓ اور عقیل بھی حضرت علی رضؓ کے مقابلہ کیلئے کھڑے ہو جائینگے۔

مصنف کے ترجمہ کی ایسی غلطیوں کی طرف اشارہ کرکے جو اپنی وضع سے بتا رہی ہیں کہ جان بوجھ کر اپنے مضمون کو زوردار بنانے کے لئے کی گئی ہیں۔ اب میں اس حدیث کی حقیقت پر روشنی ڈالتا ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس حدیث کے بعض حصے نہائت قابل اعتراض ہیں۔ اور اگر وہ ثابت ہوں تو حضرت عمر رضؓ پر اعتراض آتا ہے اور اگر نہ ثابت ہوں تو حدیث جھوٹی قرار پاتی ہے میں اس امر میں مصنف ہفوات سے بالکل متفق ہوں کہ یہ حدیث بالکل جھوٹی ہے لیکن اس کا اثر علمائے اہل سنت پر کچھ نہیں پڑتا۔ کیونکہ یہ حدیث اہل سنت کی کتب معتبرہ میں سے نہیں ہے بلکہ اس کا اول راوی ایک ایسا شخص ہے جو کہ نہ سُنی کہلا سکے اور نہ شیعہ مگر اس کی طبیعت کا اصل رجحان

شیعیت کی طرف ہی۔ پس اوّل تو جیسا کہ میں ثابت کر چکا ہوں بعض حدیثوں کے جھوٹا ثابت ہونے سے نہ علم حدیث پر اور نہ علمائے اہل سنت پر کوئی حرف آسکتا ہے۔ دوم یہ حدیث اہل سنت کی کتب سے نہیں شروع ہوئی اسکی ابتدا ان لوگوں سے شروع ہوئی ہے جو شیعیت کی طرف مائل ہیں۔ پس اگر اس سے کسی پر الزام لگ سکتا ہے تو شیعوں پر۔ سوم میں جہاں تک سمجھتا ہوں بیشتر یہ حدیثیں ان بعض شیعوں کی بنائی ہوئی ہے جو جھوٹ کو اپنی تائید کے لئے جائز سمجھتے ہیں اور تقیہ کو دین کا ایک جزو قرار دیتے ہیں۔ اور مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ احادیث پر ایک مجموعی نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اہل شیعہ نے ظلماً اپنے مقاصد کے حصول کیلئے جھوٹی حدیثیں اہل سنت سے بیان کی ہیں تاکہ ان کی کتب سے اپنے مطلب کی روایات پیش کر سکیں۔ ایسی کئی حدیثیں ہیں جنہیں درایتاً اور روایتاً انسان جھوٹا ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے اور پھر ساتھ ہی اسکو یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ یہ اہل سنت کی بنائی ہوئی نہیں ہیں بلکہ اہل شیعہ کی ہیں۔

میرا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ اہل سنت لوگوں میں ایسا کوئی شخص نہیں گزرا جس نے جھوٹی حدیث بنائی ہو یا یہ کہ شیعہ لوگ مذہباً جھوٹ بولتے ہیں۔ حاشا وکلا اس سے زیادہ میرے ذہن سے اور کوئی بات دور نہیں ہو سکتی۔ میں طبعاً اور اخلاقاً اور عقلاً اور مذہباً اس امر کا مخالف ہوں کہ کسی قوم کو محض اختلاف عقائد کی وجہ سے ایسا سمجھ لیا جائے کہ اس میں گویا اخلاقی طور پر کوئی نیک ہی نہیں۔ میرے نزدیک شیعوں میں بھی سچ بولنے والے موجود ہیں جس طرح کہ ہندوؤں اور مسیحیوں اور یہودیوں اور سکھوں اور اہل سنت میں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جس قوم میں دینداری زیادہ ہوگی اسکے زیادہ افراد با اخلاق ہونگے اور اس کا معیار اخلاق بھی بالا ہوگا لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ دنیا کی ہر قوم میں ایسے لوگ موجود ملیں گے جو ایک حد تک اخلاق کے پابند ہونگے اور بڑی بڑی بدخلقیوں سے پاک ہونگے۔ اسی طرح خواہ کوئی مذہب کتنا ہی تصرف اپنے پیروؤں پر رکھتا ہو اسلئے پیروؤں میں ایسے لوگ ضرور پائے جائینگے جو بداخلاقیوں کے مرتکب ہونگے اور انسانیت کا جامہ پھاڑ چکے ہونگے۔ پس میں یہ وضاحت بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں ہرگز کسی قوم کو جو میرے ساتھ مذہباً اختلاف رکھتی ہے اخلاق سے عاری نہیں سمجھتا اور نہ خیال رکھتا ہوں کہ جو لوگ میرے ہم خیال یا ہم مذہب ہیں وہ تمام کے تمام بلا استثناء بدیوں اور گناہوں سے پاک ہیں

اور ان میں کوئی بھی بد خلقی نہیں پائی جاتی۔ مگر میں یہ ضرور کہتا ہوں کہ اگر کسی قوم میں یہ عقیدہ ہو کہ انسان اپنے عقیدہ اور یقین کے خلاف ضرورت وقت کو مدنظر رکھکر بیان کر سکتا ہے اور عمل پیرا ہو سکتا ہے وہ قوم بہت زیادہ اس خطرہ میں ہے کہ اس کے کمزور اور ضعیف الاخلاق لوگ جھوٹ اور فریب کی مرض میں مبتلا ہو جائیں اور میں سمجھتا ہوں کہ بعض اہل شیعہ نے اس قسم کا عقیدہ ایجاد کر کے اپنے ہم مذہبوں پر ایک اخلاقی ظلم کیا ہے اور دوست بنکر دشمنوں کا کام کیا ہے مگر میں فطرت انسانی کو مدنظر رکھتے ہوئے کہتا ہوں کہ اکثر اہل شیعہ یقیناً اس خیال سے نفرت رکھتے ہونگے اور ائمہ اہل بیت کو اس ناپاک خیال سے پاک سمجھتے ہونگے اور اس گند کو انکی طرف منسوب نہیں کرتے ہونگے۔ بلکہ یقین رکھتے ہونگے کہ بعض نادان لوگوں نے یہ باتیں بعد میں گھڑی ہیں نہ تو ائمہ اہل بیت کبھی رشتہ اس جرم کے مرتکب ہو سکتے ہیں۔ مگر بہر حال چونکہ بعض لوگوں نے اس قسم کا عقیدہ گھڑا ہے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اہل شیعہ میں اہل سنت کی نسبت بہت زیادہ لوگوں کو جھوٹی حدیثیں بنانیکا موقع ملگیا ہے اور ان میں سے بعض نے افسوس سے کہنا چاہیئے کہ اہل سنت کا جامہ پہنکر شیعیت کے عقائد کو پردے پردے میں اہل سنت کی روایات میں داخل کرنا چاہا ہے۔

میں کہہ چکا ہوں کہ ائمہ اہل حدیث کا طریق یہ تھا کہ وہ احادیث کیلئے ایک خاص معیار مقرر کر کے جو حدیث اس معیار کے مطابق ان کو پہنچتی تھی وہ اسے روایت کر دیتے تھے۔ گو ان میں سے بعض جھوٹی بھی ہوں۔ اور جیسا کہ میں پہلے لکھ آیا ہوں ان کا یہ طریق نہایت عمدہ اور دوراندیشی پر مبنی تھا پس اگر اس حدیث کے راوی کو گو کہ یہ صحاح میں یا معتبر کتب حدیث میں درج نہیں دیانتدار قرار دیا جائے تو اس کی نسبت یہی کہا جائیگا کہ اسنے اپنے مقرر کردہ معیار پر اس حدیث کو صحیح پاکر اسے اپنی کتاب میں درج کر دیا گو ممکن ہے کہ وہ خود بھی اسے جھوٹا سمجھتا ہو۔ اور جیسا کہ قوی قرائن سے ثابت ہے یہ کسی ایسے ہی شیعہ کی بنائی ہوئی ہے۔ جسنے اپنے مذہب کو چھپا کر اپنے عقیدہ کی اشاعت کیلئے جھوٹ کو اپنا شیوہ بنایا ہوا ہوگا۔

میں اپنے اس خیال کی تائید میں مندرجہ ذیل شہادتیں پیش کرتا ہوں (۱) یہ حدیث جیسا کہ خود اس کی عبارت سے ثابت ہے۔ جھوٹی ہے۔ (۲) جب یہ جھوٹی ہے تو اس کو بنانے والا کوئی

ہو سکتا ہے جس کو اس حدیث کے مضمون سے فائدہ پہونچ سکتا ہو اور (۳) یہ فائدہ ایک شیعہ ہی پہنچ سکتا ہے (۴) پس یہ کسی اہل شیعہ کی بناوٹ ہے۔

اس امر کا ثبوت کہ یہ روایت محض جھوٹی اور بناوٹی ہے مندرجہ ذیل ہے:۔

۱۔ اس روایت کی بنیاد اس امر پر ہے کہ حضرت علی رضؓ کو خواہش خلافت تھی اور وہ اپنی آپ کو اس کا حقدار سمجھتے تھے حتیٰ کہ حضرت عمر رضؓ کے وقت تک اس کا اظہار کرتے رہتے تھے اور یہ امر روایتاً و درایتاً بالکل باطل ہے پس معلوم ہوا کہ یہ روایت بالکل جھوٹی ہے۔ کیونکہ واقعات کے برخلاف ہے۔

درایتاً تو یہ امر اسلئے غلط ہے کہ یہ خیال کر لینا کہ حضرت علی رضؓ جیسا بہادر اور شجاع انسان ایک امر کو حق سمجھکر پھر اسپر خاموش رہے اور رسول کریم صلعم کی وصیت کو پس پشت ڈالدے اور عالم اسلام کو تباہ ہونے دے بالکل عقل کے خلاف ہے۔ یہ امر ثابت ہے کہ حضرت علی رضؓ نے حضرت ابوبکر رضؓ کی بھی بیعت کی اور پھر حضرت عمر رضؓ کی بھی بیعت کی اور پھر ان کے ساتھ ملکر کام کرتے رہے اب ایک شخص جو دوسرے کی غلامی کا جوا اپنی گردن پر رکھ لیتا ہے اور اس کی بیعت میں شامل ہو جاتا ہے اور اسکے ساتھ مل کر کام کرتا ہے اس کی نسبت یہ خیال کرنا کہ وہ دل میں نیابت کو اپنا حق سمجھتا تھا اور حق بھی لیاقت کی وجہ سے نہیں بلکہ منشائے شریعت کے ماتحت۔ اسکے معنے دوسرے الفاظ میں یہ ہیں کہ وہ شخص اول درجہ کا منافق تھا۔ اور یہ بات حضرت علی رضؓ کی نسبت امکانی طور پر ذہن میں لانی بھی گناہ معلوم ہوتی ہے۔ کجا یہ کہ اسکے وقوع پر یقین کیا جائے۔ پس حضرت علی رضؓ کا طریق عمل اس خیال کو باطل کر رہا ہے۔ . . . .

. . . . . . اور جبکہ عقل اس امر کو تسلیم نہیں کر سکتی کہ حضرت علی رضؓ ظاہر میں حضرت عمر رضؓ کے دوست بنے ہوئے ہوں، اور ان کی بیعت میں ہوں اور دل میں یہ خیال کرتے ہوں کہ خدا اور اسکے رسول کے حکم کے ماتحت، وہ خلیفہ ہیں۔ تو ماننا پڑتا ہے کہ یہ روایت عقل کے خلاف ہونیکے سبب بناوٹی اور جھوٹی ہے۔

دوسری بات جو اسکو بالبداہت باطل ثابت کرتی ہے یہ ہے کہ حضرت علی رضؓ نے اپنی لڑکی کی شادی، حضرت عمر رضؓ سے کی ہے۔ اب کونسا شخص ہے جو حضرت علی رضؓ کو ایک اعلیٰ درجہ کا ولی تو الگ رہا ایک غیور مسلمان سمجھتے ہوئے بھی یہ خیال کر سکیگا کہ انہوں نے اپنی لڑکی ایک منافق کو دیدی حالانکہ

قرآن کریم میں رشتہ ناطہ کے تعلقات میں سب سے زیادہ زور تقوی پر دیا ہے۔ اگر حضرت علیؓ جیسا انسان خوف سے یا لالچ سے اپنی لڑکی ایک منافق کو دے سکتا ہے تو ایمان کا ٹھکانا کہیں نہیں رہتا اور اسلام ایک موہوم بات ہو جاتا ہے۔ پس حضرت علی رضؓ کا حضرت عمر رضؓ کو اپنی لڑکی بیاہ دینا اس امر پر شاہد ہے کہ وہ ان کو غاصب اور منافق خیال نہیں کرتے تھے بلکہ ایک سچا متقی اور حقدار خلافت سمجھتے تھے۔ میں تو حیران ہوتا ہوں کہ وہ لوگ جو خیال کرتے ہیں کہ حضرت علیؓ حضرت عمرؓ کو منافق سمجھتے تھے کس طرح خوارج کو اس بات کے کہنے کا موقع دیتے ہیں کہ حضرت علی رضؓ نعوذ باللہ من ذالک خلافت کی خواہش میں ایسے مخمور تھے کہ انہوں نے اپنی بے گناہ لڑکی حضرت رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی نواسی ایک منافق اور بے دین شخص کو جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی وصیت کے خلاف خلافت اور نیابت کے حق کو غصب کر کے دین کی بربادی اور تباہی میں مشغول تھا، دیدی انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مصنف صاحب ہفوات کو اگر اس نکاح میں شبہ ہو تو وہ شیعہ کتب مثلاً کلینی وغیرہ دیکھیں انہیں معلوم ہو جائیگا کہ کتب اہل شیعہ میں بھی اس نکاح کا ذکر ہے گو ایسے الفاظ میں ہے کہ شریف آدمی رسول کریم صلعم کے خاندان کے متعلق انہیں استعمال نہیں کر سکتا۔

روایت کے علاوہ تاریخی طور پر بھی ایسے ثبوت ملتے ہیں کہ جو اس بات کو باطل قرار دیتے ہیں کہ حضرت علی رضؓ دل میں خواہش خلافت رکھتے تھے۔ یا یہ کہ حضرت عمر رضؓ کو ان پر شبہ تھا۔ چنانچہ تاریخ سے ثابت ہے کہ حضرت عمر رضؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں بعض سفروں کے پیش آنے پر حضرت علی رضؓ کو اپنی جگہ مدینہ کا امیر مقرر فرمایا تھا۔ چنانچہ تاریخ طبری میں لکھا ہے کہ واقعۂ جسر کے موقع پر جو مسلمانوں کو ایرانی فوجوں کے مقابلہ پر ایک قسم کی زک اُٹھانی پڑی تو حضرت عمر رضؓ نے لوگوں کے مشورہ سے ارادہ کیا کہ آپ خود اسلامی فوج کے ساتھ ایران کی سرحد پر تشریف لیجائیں تو آپ نے اپنے پیچھے حضرت علی رضؓ کو مدینہ کا گورنر مقرر کیا۔ اب ہر ایک عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ اگر حضرت علی رضؓ پر حضرت عمر رضؓ کو ذرہ بھی شبہ ہوتا جیسا کہ اوپر کی روایت کے راوی نے ثابت کرنا چاہا ہے تو پھر وہ اپنی غیبت کے دنوں میں ان کو دار الخلافہ مدینہ کا گورنر کیوں مقرر کرتے؟ کیا ایسے شخص کو جس پر بدظنی ہوتی ہے کوئی عقلمند صدر مقام کا با اختیار حاکم بنا سکتا ہے؟ وہ ضرور خوشا

کرتا ہے کہ ایسا نہ ہو میرے جانے کے بعد ملک میں بغاوت کرکے یہ شخص حکومت پر قابض نہ ہو جائے
پس اگر فی الواقع حضرت عمرؓ کو حضرت علیؓ پر کوئی شبہ ہوتا تو کسی صورت میں بھی آپ ان کو اپنی
غیبت کے ایام میں مدینہ کا گورنر نہ مقرر کرتے۔ اگر کوئی شیعہ صاحب یہ کہیں کہ اس سفر میں تو حضرت
عمرؓ چار یا پانچ دن کے بعد ہی واپس آگئے تھے اور لشکر کی کمان حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کو
سپرد کر دی تھی تو انہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ اسکے بعد جب بیت المقدس کا محاصرہ مسلمانوں نے کیا
ہے اور وہاں کے لوگوں نے اسوقت تک ہتھیار ڈالنے سے انکار کیا ہے جبتک کہ خود حضرت عمرؓ
وہاں تشریف نہ لائیں۔ تو اس وقت بھی حضرت عمرؓ حضرت علیؓ کو ہی اپنے بعد مدینہ کا گورنر مقرر
کر گئے تھے حالانکہ آپ کو کئی ماہ کا سفر پیش تھا جس میں دشمن کچھ کا کچھ کر سکتا ہے۔ پس اگر یہ درست
ہے کہ حضرت عمرؓ کو حضرت علیؓ پر شک تھا یا ان کے حضرت علیؓ سے تعلقات اچھے نہ تھے
تو کب ممکن تھا کہ وہ انہیں مدینہ جیسے اہم مقام کا جو تمام فوجی طاقت کی کنجی تھی والی مقرر کر جاتے
اگر فی الواقع ان کے دل میں کوئی شک ہوتا تو وہ ضرور انہیں اپنے ساتھ لیجاتے تا کہ وہ ان کے
پیچھے کوئی فتنہ نہ کھڑا کر دیں۔ اب ایک طرف تو حضرت عمرؓ کا فعل ہے کہ آپ دو دفع حضرت علیؓ
کو اپنے بعد مدینہ کا گورنر مقرر کرتے ہیں۔ اور ان پر اس انتہائی درجہ کے اعتماد کا ثبوت دیتے ہیں
جو ایک بادشاہ اپنی رعایا کے متعلق رکھ سکتا ہے۔ دوسری طرف مذکورہ بالا روایت ہے کہ حضرت
عمرؓ کو حضرت علیؓ پر شک رہتا تھا کہ شاید خلافت کے حصول کا خیال ابتک ان کے دل میں
باقی ہے۔ ان دونوں چیزوں میں ہم کسے ترجیح دیں؟ حضرت عمرؓ کی فعلی شہادت کو یا ایک
راوی کی روایت کو جس کی روایات فتنہ پردازی میں خاص شہرت رکھتی ہیں۔ پس مندرجہ بالا
واقعات سے درایتاً و روایتاً دونوں طرح روز روشن کی طرح ثابت ہو جاتا ہے کہ حضرت علیؓ کو
حضرت عمرؓ سے کچھ پرخاش نہ تھی۔ اور نہ حضرت عمرؓ کو ان پر کسی قسم کی بدظنی تھی اور راوی کی
روایت محض جھوٹ اور افترا ہے۔

دوسرا ثبوت اس روایت کے جھوٹے ہونے کا خود اس کی اپنی عبارت ہے آپ نے
لکھا ہے کہ حضرت علیؓ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں اجرت پر پانی بھرنے جایا کرتے تھے
حالانکہ ایک بچہ بھی جانتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں تمام اہل بیت کے

بیش بہا وظائف مقرر کر چھوڑے تھے اور حضرت علی رضؓ کو حسنین رضؓ کے وظائف ملا کر کوئی پندرہ بیس ہزار سالانہ ملجاتا تھا۔ اب ایسے شخص کی نسبت جس کی آمد پندرہ بیس ہزار روپیہ سالانہ ہو۔ یہ کہنا کہ وہ کسی کے باغ میں پانی بھر کے روٹی کمایا کرتا تھا کس قدر خلاف عقل ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ کسی شخص نے جسے علم تاریخ سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ آنحضرت صلعم کے زمانہ کے بعض حالات سُنکر جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی رضؓ کسب حلال کے لئے مزدوری کرلیا کرتے تھے اس حدیث میں یہ بات بھی درج کردی ہے اور یہ خیال نہیں کیا کہ حضرت عمر رضؓ کے زمانہ میں مسلمانوں کی حالت اور تھی اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں اور۔

جب یہ ثابت ہوگیا کہ یہ روایت جھوٹی ہے تو ساتھ ہی یہ بھی ثابت ہوگیا کہ یہ کسی ایسے ہی شخص نے بنائی ہے جسے اس حدیث سے فائدہ پہنچتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ اس کا فائدہ سنیوں کو نہیں پہنچتا ہے بلکہ اس حدیث میں حضرت عمر رضؓ پر اعتراض کیا گیا ہے۔ اس لئے سُنّی جان بوجھکر ایسی حدیث ہرگز نہیں بنا سکتا۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ اس حدیث سے کس قوم کو فائدہ پہنچتا ہے سو ظاہر ہے کہ اس حدیث سے شیعوں کو کئی طرح فائدہ پہنچتا ہے۔ اوّل اس میں حضرت عمر رضؓ پر ہنسی اُڑائی گئی ہے کہ آپ ایک ٹوکرا کھجوروں کا کھا گئے۔ اور ایک ٹھلیا پانی کی پی گئے۔ دوم حضرت علی رضؓ کی مظلومیت بتائی گئی ہے کہ جب کہ تمام مسلمانوں کے گھر دولت سے بھر رہے تھے اور ادنیٰ سے ادنیٰ صحابی کا بھی چار ہزار درہم سالانہ مقرر تھا آپ کو کوئی نہیں پوچھتا تھا اور آپ لوگوں کے کھیتوں پر پانی بھر بھر کر گذارہ کیا کرتے تھے۔ تیسرے یہ بتایا گیا ہے کہ جبکہ حضرت عمر رضؓ ٹوکرے بھر بھر کر کھجوریں کھاتے اور غیبت میں مشغول رہتے۔ حضرت علی رضؓ مزدوری کرتے اور تلاوت قرآن میں مشغول رہتے چوتھے یہ بتایا گیا ہے کہ حضرت عباس رضؓ بھی حضرت علی رضؓ کے دعوائے خلافت کے مؤید تھے۔ اب ہر اک شخص جو تعصب سے خالی ہوا سے تسلیم کرے گا کہ ان سب باتوں کا فائدہ شیعہ صاحبان کو ہی پہنچتا ہے اور انہی کے عقائد اور دعووں کی اس میں تصدیق ہوتی ہے پس جب یہ ثابت ہوچکا ہے کہ یہ حدیث روایتاً اور درایتاً جھوٹی ثابت ہوتی ہے تو اس امر

ثابت ہو جانے پر کہ اس حدیث کے مضمون کا فائدہ شیعہ صاحبان کو ہی پہنچتا ہے کس عقلمند کو اس بات کے تسلیم کرنے میں شبہ ہو سکتا ہے کہ اس حدیث کا بنانے والا کوئی دھوکا خوردہ شیعہ تھا جس نے مذہب کی حقیقت کو نہ سمجھتے ہوئے سچ کی تائید کے لئے ہر ایک تدبیر کا اختیار کرنا جائز ہے کے شرمناک مسئلہ پر عمل کیا ہے۔ پس مصنف صاحب ہفوات کو سنیوں کے بزرگوں کو گالیاں دینے کا حق نہیں انہیں اپنے ہی بھائی بندوں کو سنانا چاہیئے۔

یہ امر یاد رکھنا چاہیئے کہ باوجود اسکے کہ اس حدیث کا جھوٹا ہونا روز روشن کی طرح ثابت ہے میرے نزدیک اس کا احراق اور احکاک جائز نہیں کیونکہ جیسا کہ میں شروع میں ثابت کر چکا ہوں کسی کا حق نہیں کہ کسی مصنف کی تصنیف میں اپنی مرضی کے مطابق کوئی تغیر کرے اگر مصنف صاحب ہفوات فرمائیں کہ جب حدیث جھوٹی ثابت ہو گئی تو اسکے رکھنے کا کیا فائدہ؟ مگر میں کہتا ہوں کہ فائدہ ہو نہ ہو تصنیف ایک امانت ہے اور اس میں تغیر ایک خیانت ہے جو مسلمان کے لئے جائز نہیں لیکن یہ بھی درست نہیں کہ ایسی حدیث کے رکھنے میں کوئی فائدہ نہیں کیونکہ اس میں فائدہ ہے۔ ایسی احادیث انسانی اخلاق کے اس تاریک پہلو پر روشنی ڈالتی رہتی ہیں کہ بعض لوگ اپنے خیال کی تائید میں خدا کے مقدس رسولوں پر جھوٹ باندھنے سے بھی پرہیز نہیں کرتے۔ اور اس امر کے معلوم ہونے سے عقلمند انسان بہت سے گڑھوں سے بچ جاتا ہے۔

رد بہتان در سبکی عقل رسول و گستاخی حضرت عمر رضی اللہ عنہ

ایک اعتراض مصنف صاحب ہفوات نے یہ کیا ہے کہ مسلم کتاب الایمان جلد اول میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوہریرہ رض کو اپنی جوتیاں دیکر کہا کہ جو شخص تم کو ملے۔ اسے کہدو کہ جو لا الہ الا اللہ کہے وہ جنت میں داخل ہوگا۔ حضرت عمر رض سب سے پہلے ان کو ملے۔ ان کو حضرت ابوہریرہ رض نے یہ بات پہنچائی تو انہوں نے ابوہریرہ رض کے اس زور سے گھونسا مارا کہ وہ گر پڑے اور پھر فرمایا کہ واپس چلے جاؤ انہوں نے آنحضرت صلعم

کے پاس واپس آکر شکایت کی اتنے میں حضرت عمرؓ بھی پہنچ گئے۔ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ان سے ابو ہریرہؓ کو مارنے کی وجہ پوچھی۔ انہوں نے کہا کہ یا رسول اللہؐ! کیا آپ نے ان سے کہا تھا کہ اس طرح لوگوں کو کہدو؟ آپ نے فرمایا کہ ہاں۔ اس پر حضرت عمرؓ نے کہا کہ ایسا نہ کیجئے ورنہ لوگ خدا تعالےٰ کی عبادت ترک کر دینگے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ اچھا جانے دو۔

مصنف صاحب ہفوات نے اس حدیث پر یہ اعتراض کئے ہیں۔ (۱) کیا صحابہ جھوٹ بولا کرتے تھے کہ رسول کریم صلعم کو ابو ہریرہؓ کے ہاتھ میں اپنی جوتیاں دینی پڑیں تاکہ لوگ ان کو جھوٹا نہ سمجھیں۔ (۲) کیا حضرت عمرؓ ایسے گستاخ تھے کہ انہوں نے رسول کریم صلعم کے ایلچی کو مارا۔ (۳) کیا رسول کریم صلعم حضرت عمرؓ سے کمزور تھے کہ حضرت عمرؓ سے ڈرکر آپنے پہلی بات کا اعلان نہ کرایا؟۔

مصنف صاحب ہفوات نے خود مضمون حدیث کو صحیح تسلیم کیا ہے کیونکہ وہ اس کی تشریح کرتے ہیں کہ مراد یہ ہے کہ سردست جو توحید خدا کا بھی اقرار کرے وہ داخل امن ہے اس کی جان ومال کو کوئی جوکھوں نہیں۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ ان کو نہ قرآن کریم کا علم ہے نہ تاریخ کا نہیں یہ معلوم نہیں کہ اسلام پر کوئی بھی ایسا زمانہ نہیں آیا کہ اسنے صرف توحید پر ایمان لانے کو موجب نجات قرار دیا ہو۔ قرآن کریم کی نہایت ہی ابتدائی سورتوں میں بھی ایمان اور عمل دونوں کو نجات کے لئے ضروری قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ سورہ العلق جو سب سے پہلی سورۃ ہے جو رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئی اس میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَیَطْغٰٓی اَنْ رَّاٰہُ اسْتَغْنٰی۔ اِنَّ اِلٰی رَبِّکَ الرُّجْعٰی۔ اَرَاَیْتَ الَّذِیْ یَنْھٰی عَبْدًا اِذَا صَلّٰی یعنی انسان سرکش ہے کہ وہ اپنے آپ کو خدا تعالےٰ کی مدد سے مستغنی سمجھتا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالےٰ کیطرف ہی ہر ایک امر میں لوٹنا پڑتا ہے۔ کیا تجھے اس شخص کا حال معلوم ہے جو ایک بندہ کو جب وہ نماز پڑھتا ہے روکتا ہے۔ سورۃ شمس میں کہ وہ بھی مکیہ ہے فرماتا ہے قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰھَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰھَا۔ جو شخص اپنے نفس کو پاک کریگا وہ کامیاب ہوگا اور جو اسے روند ڈالیگا وہ ناکام ونامراد رہیگا۔ پھر سورۃ تین مکیہ میں فرماتا ہے اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ

وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ یعنے سب لوگ تباہ ہونگے سوائے ان لوگوں کے کہ ایمان بھی لائیں اور نیک عمل بھی کریں انہیں لازوال بدلے ملیں گے۔ سورۃ قارعہ میں جو وہ بھی مکّی سورۃ ہے فرماتا ہے۔ فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ جس کے نیک عمل زیادہ ہونگے وہ تو پسندیدہ زندگی بسر کرے گا اور جس کے نیک عمل بدیوں سے کم ہونگے اس کا مقام دوزخ ہوگا۔ ان آیات سے ثابت ہے کہ شروع سے اسلام ایمان اور اعمال کی اصلاح پر زور دیتا چلا آیا ہے۔ اور کسی وقت بھی اس نے یہ رخصت نہیں دی کہ صرف لا اِلٰہ اِلّا اللّٰہ پر ایمان لے آؤ۔ کیونکر درست ہوسکتا ہے؟

اگر فرض بھی کر لیا جائے کہ کوئی زمانہ اسلام پر ایسا بھی آیا ہے تب بھی اس حدیث کے یہ معنے نہیں ہو سکتے کیونکہ جیسا کہ تاریخ اسلام کے واقف لوگ جانتے ہیں حضرت ابوہریرہ رضؓ ہجرت کے بعد رسول کریم صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کی وفات سے صرف ساڑھے تین سال پہلے ایمان لائے تھے یعنی صلح حدیبیہ اور جنگ خیبر کے درمیان کے زمانہ میں۔ دوسرے جیسا کہ اس حدیث کے الفاظ سے بھی ظاہر ہے اور دوسری تاریخی شہادتوں سے بھی معلوم ہوتا ہے یہ واقعہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات سے صرف دو سال پہلے کا ہے جبکہ مدینہ پر بعض مسیحی قبائل کے حملہ کی افواہیں گرم تھیں ان ایام میں رسول کریم صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کا ذہنی الجھنوں سے او جھل ہونا مسلمانوں میں گھبراہٹ پیدا کر دیتا تھا پس جو واقعہ کہ عرب کی فتح کے بعد اور مشرکوں کے مغلوب ہو جانے کے بعد ہوا ہے۔ اس کی نسبت یہ کہنا کہ اس کا یہ مطلب ہے کہ سردست اتنا کافی ہے کہ لا اِلٰہ اِلّا اللّٰہ کہہ دو۔ کس قدر حماقت اور بے وقوفی کی بات ہے۔ کیا اس قسم کی آسانیاں ابتدا میں دی جاتی ہیں یا آخر میں؟ پس اس حدیث کا وہ مطلب ہرگز نہیں جو مصنف ہفوات نے سمجھا ہے۔ اور اس غلط مطلب کا نتیجہ ہے کہ انہیں دخل الجنۃ کا ترجمہ یہ کرنا پڑا ہے کہ وہ داخل امن ہے اسکی جان و مال کو کوئی خطرہ نہیں۔ جنت کا یہ ترجمہ خود مصنف کی خیالات کی پریشانی

پر دلالت کرتا ہے نعمائے دنیوی کا نام تو بے شک جنت رکھا جا سکتا ہے لیکن یہ مضمون بیان کرنے کے لئے کہ ہم اسے کچھ نہیں کہیں گے۔ جنت کے لفظ کا استعمال صرف انہی کے دماغ کی اختراع ہے۔

جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ اس حدیث کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ جو صرف لا الٰہ الا اللہ کہہ دے وہ جنت میں داخل ہو جائے گا۔ نہ یہ مطلب کہ اسے ہم کچھ نہیں کہینگے تو اب سوال یہ ہے کہ اس کا کیا مطلب تھا؟ سو یاد رکھنا چاہئیے کہ ہر ایک تعلیم کا ایک مرکزی نکتہ ہوتا ہے اور اختصار کے لئے کبھی اس مرکزی نکتہ کو بیان کر دیا جاتا ہے اور مراد یہ ہوتی ہے کہ تمام تفصیلات اس کے اندر شامل ہیں اور یہی نکتہ تھا جسے سمجھانے کے لئے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوہریرہ رضؓ کو بھیجا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ تنہائی کے مقام پر توحید کے حقائق پر غور کرتے ہوئے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جوش پیدا ہوا ہے کہ میں ایک نئے رنگ میں امت کو توحید کے نکتۂ مرکزی ہونے کی طرف توجہ دلاؤں اور اسکے لئے آپ نے یہ طریق اختیار کیا کہ ایک صحابی کو اس کا اعلان کرنے کے لئے مقرر کر دیا۔ حضرت عمر رضؓ رستہ میں ملے تو آپ کو دو خیال پیدا ہوئے (۱) اگر اس پیغام کو محدود معنوں میں لیا جائے (جن معنوں میں کہ مصنف ہفوات نے قلت تدبر کی وجہ سے لیا ہے) تو وہ درست نہیں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کبھی یہ نہیں کہہ سکتے کہ صرف لا الٰہ الا اللہ کہنا کافی ہے جبکہ قرآن و تعلیم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان معنوں کو رد کر رہے ہیں پس ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو سمجھنے میں غلطی لگی ہے اور ان کو روکنا ضروری ہے (۲) اگر اس کی بجائے اسکے عام معنے لئے جائیں تو یہ درست ہی لیکن ممکن ہے کہ لوگ اس کے معنے غلطی سے کچھ اور لے لیں اور اسلام میں رخنہ اندازی کریں۔ چونکہ آپ جانتے تھے کہ جس نکتہ کو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سمجھانا چاہتے ہیں خاص لوگ اسے پہلے ہی آپ کی تعلیم کے اثر سے سمجھ چکے ہیں اور عوام ان الفاظ سے دھوکا کھا سکتے ہیں اسلئے آپ نے حضرت ابوہریرہ رضؓ کو روکا۔ حضرت ابوہریرہ رضؓ چونکہ اس باریک بینی سے حصہ نہ رکھتے تھے جس سے عمر رضؓ۔ انہوں نے نہ مانا اور اس پر حضرت عمر رضؓ نے ان کو دھکا دیکر واپس کرنا چاہا اور وہ

گر گئے ورنہ عقل اس امر کو باور نہیں کر سکتی کہ بغیر کچھ بات کہے کے حضرت عمرؓ نے ابو ہریرہؓ کو مارا ہو۔ غرض جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچکر آپنے حقیقت کا اظہار کیا تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپ کی بات کو تسلیم کر لیا۔ اور آپ کا تسلیم کر لینا ہی بتاتا ہے کہ حضرت عمرؓ کے خیال کو آپنے صحیح سمجھا۔ باقی رہا یہ خیال کہ کیا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کا خیال نہ کیا جس کا حضرت عمرؓ نے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تعلق لوگوں سے اور قسم کا تھا اور حضرت عمرؓ کا اور قسم کا حضرت عمرؓ چونکہ بے تکلفی سے لوگوں میں ملتے تھے آپ اس گروہ سے واقف تھے جو اپنی بے ایمانی یا عقل کی کمزوری کی وجہ سے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی باتوں کو غلط رنگ دینے یا غلط طور پر سمجھنے کی مرض میں مبتلا تھا پس جب انہوں نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان لوگوں کی طرف توجہ دلائی کہ ایسے لوگ اس حدیث کو سنکر عمل ہی چھوڑ بیٹھیں گے۔ تو آپ نے بھی ان لوگوں کو ٹھوکر سے بچانے کے لئے اور یہ دیکھتے ہوئے کہ حضرت عمرؓ جیسے لوگ اس مسئلہ کو سمجھ ہی چکے ہیں پس یہ صداقت مسلمانوں میں سے مٹیگی نہیں اپنے حکم کو منسوخ کر دیا اور ان الفاظ میں اعلان کرانے کی ضرورت نہ سمجھی جن الفاظ میں اعلان کرنے کا حکم کہ اس سے پہلے آپنے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو دیا تھا۔

غرض یہ حدیث ہرگز قابل اعتراض نہیں ہے اور اس پر اعتراض صرف جہالت سے پیدا ہوا ہے جو تدبر کرنے والے لوگ ہیں وہ جانتے ہیں کہ اس حدیث سے بجائے اعتراض کے صحابہ کا درجۂ عظیم ظاہر ہوتا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ (۱) وہ لوگ دین کے لئے غیرت رکھتے تھے اور رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے تعلیم کے مغز کی حفاظت پر بہت حریص تھے (۲) وہ لوگ آپ کے اشارات کو خوب سمجھتے تھے اور پیشتر اسکے کہ آپ بالوضاحت کسی امر کو بیان کریں آپ کے کلام کی تمہیدات سے ہی آپ کے مطلب کو سمجھ جاتے تھے (۳) یہ کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان لوگوں کے اخلاص پر پورا الیقین تھا۔ اور آپ ان کے مشوروں کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے

تعجب ہے کہ مصنف ہفوات اپنی اندرونی کیفیت کی وجہ سے اس خیال کی طرف تو چلے گئے کہ حضرت عمرؓ کی سمجھ میں جو بات آئی حضرت نبی کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سمجھ میں نہیں آئی مگر ادھر ذہن نہ گیا کہ حضرت عمرؓ چونکہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مفہوم اچھی طرح سمجھ گئے تھے اس لئے آپ نے اس اعلان کرانے کی ضرورت نہ سمجھی تا نا اہل لوگ دھوکا نہ کھائیں۔

مصنف صاحب ہفوات نے اس جگہ اپنے بغض کے اظہار کے لئے یہ طریق بھی اختیار کیا ہے کہ بزعم خود حضرت عمرؓ کے چند عیوب بیان کرکے لکھے ہیں۔ کہ کیا ایسا شخص رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بات کو رد کر سکتا تھا؟ میں جیسا کہ بتا چکا ہوں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بات کے رد کرنیکا اوپر کے واقعہ سے کوئی ثبوت ہی نہیں ملتا۔ بلکہ آپ کی حقیقی تعلیم کے سمجھنے اور اس کی تصدیق کرنیکا علم ہوتا ہے پس یہ تو سوال ہی نہیں باقی رہا یہ کہ حضرت عمرؓ حضرت رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ڈرتے تھے۔ یہ عیب کی بات نہیں خوبی ہے۔ میں اس شیعہ کو دیکھنا چاہتا ہوں کہ جو یہ کہے کہ حضرت علیؓ رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نہیں ڈرتے تھے۔ نبیوں سے ڈرنا عین ایمان کی علامت ہے اور صرف بے ایمان ہی اس جذبہ سے خالی ہوتا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ سے پر ایمان خوف ورجاء کے درمیان ہے اسی طرح نبیوں پر ایمان بھی خوف و محبت کے درمیان ہے۔ جبتک دونوں جذبات نہ پائے جائیں ایمان کامل ہو ہی نہیں سکتا لیکن تعجب یہ ہے کہ مصنف ہفوات اپنے دعوے کو ثابت کرنیکے لئے جو مثال پیش کرتے ہیں وہ حد درجہ کی کمزور اور بودی ہے وہ تفسیر حسینی اور تحفہ ... کے حوالہ سے اول تو یہ بیان کرتے ہیں کہ جو آیت حرمت شراب کے متعلق نازل ہوئی تھی وہ حضرت عمرؓ اور معاذؓ کو خاص طور پر بلا کر سنائی جاتی تھی۔ لیکن آپ ہمیشہ یہی کہتے رہے کہ اے خدا حرمت شراب کے بارے میں اور واضح بیان نازل فرما۔ لیکن جب وہ نہ مانے تو پھر جو کچھ ہوا وہ بقول مصنف یہ تھا کہ حضرت عمرؓ شراب سے باز نہ آئے اور آخر رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو مارا اور تب جا کر وہ باز آئے۔

مذکورہ بالا بیان میں مصنف ہفوات نے یہ اعتراض کئے ہیں۔ اول حضرت عمرؓ شراب پیا کرتے تھے دوم ان کی حالت کو دیکھکر رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم خاص طور پر بلاکر انہیں احکام حرمت سنوایا کرتے تھے۔ سوم باوجود اس کے وہ باز نہ آتے اور یہی کہتے جاتے تھے کہ خدایا حرمت شراب کے حکم کو اور بھی واضح کر۔ مجھے ہفوات کے مصنف پر تعجب ہے کہ وہ صریح کلام کی موجودگی میں ہمیشہ اُلٹی چال چلتے ہیں اور غلط معنے ہی لیتے ہیں۔ اصل حدیث کو دیکھکر کوئی شخص ایک منٹ کیلئے بھی نہیں خیال کرسکتا کہ حضرت عمرؓ کو شراب کی عادت تھی اور وہ اسے چھوڑتے نہ تھے اسلئے ان کو احکام سُنائے جاتے تھے مگر وہ پھر بھی نہ مانتے تھے بلکہ الفاظ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ شراب کے مخالف تھے اور ان کے اس شوق کی وجہ سے رسول کریم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کو شراب کے متعلق آیات سُنایا کرتے تھے مگر چونکہ اسوقت تک قطعی حکم ممانعت کا نہ آیا تھا۔ حضرت عمرؓ خواہش کرتے کہ کاش اس سے بھی واضح الفاظ میں شراب حرام کی جائے تاکہ کوئی شخص اس کے قریب بھی نہ جائے۔ چنانچہ حدیث یہ ہے: عن عمر بن الخطاب انه قال اللهم بيّن لنا فی الخمر بيان شفاء فنزلت التی فی البقرة یسئلونك عن الخمر والمیسر الآیه فدعی عمر فقرأت علیه فقال اللهم بيّن لنا فی الخمر بيان شفاء فنزلت التی فی النساء یا ایها الذین اٰمنوا لاتقربوا الصلوٰة وانتم سکاریٰ۔ فدعی عمر فقرأت علیه ثم قال اللهم بيّن لنا فی الخمر بيان شفاء فنزلت التی فی المائدة انما یرید الشیطان ان یوقع بینکم العداوة والبغضاء فی الخمر والمیسر الیٰ قوله فهل انتم منتهون فدعی عمر فقرأت علیه فقال انتهینا انتهینا۔ ترمذی مطبوعہ مصر جلد ۲ صفحہ ۱۷۶۔ یعنی عمر بن الخطاب کی روایت ہے کہ آپ نے کہا کہ اے اللہ ہمارے لئے شراب کا مسئلہ اس طرح بیان کر دے کہ پھر اور حاجت نہ رہے اسپر سورۂ بقرہ کی آیت یسئلونك عن الخمر والمیسر (تجھ سے شراب اور جوئے کے متعلق دریافت کرتے ہیں تو کہدے کہ ان سے پیدا ہونے والا گناہ ان کے نفع سے زیادہ ہے) اسپر عمرؓ کو بلایا گیا اور انہیں آیت

پڑھکر سنائی گئی مگر انہوں نے اس آیت کو سنکر پھر بھی یہ کہا کہ اے اللہ ہمارے لئے شراب کے متعلق کوئی ایسا حکم دے جو بالکل واضح ہو کہ کسی تاویل کی گنجائش نہ ہو اسپر سورۂ نساء کی یہ آیت نازل ہوئی کہ اے مومنو! جب تم نشہ کی حالت میں ہو تو نماز کے قریب نہ جاؤ۔ اس پر عمرؓ کو پھر بلایا گیا اور یہ آیت سنائی گئی مگر آپ نے پھر یہی کہا کہ اے خدا کوئی واضح حکم جس کے بعد تاویل کی گنجائش نہ ہو شراب کے بارہ میں بیان کر۔ اسپر مائدہ کی یہ آیت اتری کہ شیطان تو شراب اور جوئے کے ذریعہ سے تم میں عداوت اور بغض ہی پیدا کرنا چاہتا ہے اور اللہ کی یاد سے اور نماز سے روکنا چاہتا ہے پھر کیا تم (شراب اور جوئے سے) باز آؤ گے (یا نہیں؟) اسپر حضرت عمرؓ نے کہا کہ اب ہم باز آ گئے ہم باز آ گئے۔

اس حدیث کے الفاظ سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت عمرؓ شراب کے مخالف تھے کیونکہ حدیث میں صاف بیان ہے کہ جس وقت شراب کے متعلق ابھی کوئی حکم نہ آیا تھا اس وقت حضرت عمرؓ دعا کیا کرتے تھے کہ خدایا شراب کے متعلق کوئی حکم نازل فرما۔ اگر وہ شراب کے خواہشمند تھے تو انہیں اس دعا کی کیا ضرورت تھی؟ شراب تو پہلے ہی ملک میں رائج تھی اور سب لوگ اس کو استعمال کرتے تھے پھر اس کی حلت کے لئے دعا کرنے کی انہیں کیا ضرورت تھی؟ جو چیز ملک میں پہلے ہی سے رائج ہو اور اس سے منع نہ کیا گیا ہو کیا اس کا مشتاق یہ دعا کر سکتا ہے کہ خدایا اسکے بارہ میں کوئی واضح حکم دے۔ یہ دعا تو صرف وہی کر سکتا ہے جو اس چیز کو رکوانا چاہتا ہے۔ پس جبکہ شراب کی ممانعت نہ خدا تعالے کی طرف سے تھی نہ رسول کی طرف سے تو حضرت عمرؓ کا خدائی حکم کے لئے دعا مانگنا صاف بتاتا ہے کہ آپ اس کے حرام کئے جانے کی دعا کرتے تھے۔ اور یہی وجہ تھی کہ جب ایک آیت اس بارہ میں اتری تو رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے خاص طور پر انہیں بلا کر سنائی تا انہیں خوشی ہو کہ میری خواہش اللہ تعالےٰ کی مرضی کے ساتھ مل گئی۔ مگر چونکہ ملک میں شراب کا بہت رواج تھا حضرت عمرؓ سمجھتے تھے کہ شراب اس طرح نہ رکیگی۔ انہوں نے پھر دعا کی کہ خدایا اسے اور واضح کر۔ اس دفعہ کی دعا سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ آپ شراب کے مخالف تھے۔ کیونکہ جب کہ خدا تعالے نے یہ فرمایا تھا کہ شراب میں نقصان زیادہ ہے تو اور بھی وضاحت کی خواہش کے یہی معنے ہیں کہ صرف یہ نہ فرما

کہ اس میں نقصان ہیں بلکہ اسکو منع فرما۔ اگر وہ شراب کی تائید میں ہوتے تو اس موقع پر
چاہیئے تھا کہ یہ دعا کرتے کہ اے خدا! شراب کی خوبیاں بیان فرما اور اس آیت کو منسوخ کر دے
مگر وہ تو وضاحت چاہتے ہیں اور بری چیز کے متعلق حکم کی وضاحت اس کی حرمت کے ذریعہ سے
ہی ہو سکتی ہے۔ جب ایک اور آیت نازل ہوئی کہ نشہ کے وقت نماز کے قریب نہ جاؤ (میں ان
معنوں کو حدیث کے الفاظ کی بنا پر لے رہا ہوں ورنہ میرے نزدیک اس آیت کے معنی بالکل
اور ہیں) تو پھر آپ نے وہی خواہش ظاہر کی کہ اس سے بھی واضح حکم ہو۔ آخر صاف الفاظ میں جب
ممانعت ہوئی تو آپ کی تسلی ہو گئی۔ غرض الفاظ حدیث واضح طور پر بتلاتے ہیں کہ حضرت عمرؓ
شراب کے مخالف تھے اور یہ جو آخر حدیث میں لفظ ہیں کہ ہم باز آ گئے باز آ گئے ان سے مراد
خود حضرت عمرؓ نہیں بلکہ مسلمان بحیثیت قوم ہیں۔ اور ان الفاظ کے یہ معنے ہیں کہ اب ہماری
قوم باز آ جائیگی۔ کیونکہ حکم صاف طور پر نازل ہو گیا ہے اور اب کسی کو تاویل کی گنجائش نہ رہیگی
ورنہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ جو شخص شراب کی حرمت کی خواہش رکھتا ہو وہ خود شراب پیتا ہو
اور باز آ جانے سے اس کی مراد اپنا نفس ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس جواب سے ہر شخص پر مصنف
ہفوات کے اعتراض کی لغویت ظاہر ہو جائیگی۔ اور جو ان کی دھمکی ہے کہ حضرت عمرؓ کے
جازمہ اٹھنے پر جو کچھ ہوا اسے ہم آگے بیان کرینگے۔ میں بھی انشاء اللہ اسی موقعہ پر ان کے
اس بیان کی قلعی کھولونگا۔ والتوفیق من اللہ۔

تقاریر و تصانیف حضرت خلیفۃ المسیح ثانی
ایدہ اللہ بنصرہ

نام کتب	قیمت	نام کتب	قیمت
منصب خلافت	۱ر	ترک موالات اردو	۸ر
برکات خلافت	۴ر	” انگریزی	۲عہ ر
انوار خلافت	۱۲ر	تحفۃ الملوک قسم اوّل	۸عہ ر
حقیقۃ الرؤیا	۱۲ر	” ” دوم	۱۲ر
ذکر الٰہی	۷ر	” ” ” انگریزی	۱۲ر
عرفان الٰہی	۱۰ر	صادقوں کی روشنی	۸عہ ر
تقدیر الٰہی	عہ	تحفہ شہزادہ ویلز طبع دوم اردو	۱۴ر
ملائکۃ اللہ	۱۰ر	” ” مجلد ”	۲عہ ر
اسلام میں اختلاف کا آغاز	۱۱ر	” ” انگریزی	عا ر
ہدایات زرّیں	۱۰ر	غیر مجلد نہائت اعلیٰ کاغذ	
اسلام اور دیگر مذاہب	۴ر	کلام محمود مجلد	۱۰ر
” ” انگریزی	۶ر	خطبات محمود	۱۳ر
القول الفصل	۲ر	مدارج تقویٰ	۲ر
حقیقۃ الامر	۲ر	ہستی باریتعالیٰ	۵ر
آئینہ صداقت	۸عہ ر	نجات (حصہ اول)	۱۳ر